قرآن حکیم کی جمال آراء حکمت افروز تفسیر

تبصرہ

سُورۃ یٰسٓ

سید ریاض حسین شاہ

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ

تبصرہ
سُورۃ یٰسٓ
سید ریاض حسین شاہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تَبۡصِرَۃً وَّذِکۡرٰی لِکُلِّ عَبۡدٍ مُّنِیۡبٍ

تبصرہ
سورۂ
یٰسٓ

سیّد ریاض حسین شاہ

ادارہ تعلیمات اسلامیہ
خیابان سیّد
راولپنڈی

بسم الله الرحمن الرحيم

مـو لا ی صـل وسـلـم دا ئما ابدا
عـلـی حبیبک خیر الخلق کلهم

حرف اعتراف

''سورہ یٰس'' پر چند ٹوٹے پھوٹے بے ربط جملے پڑھنے سے پہلے یہ ذہن میں ضرور رکھئے گا کہ ''تبصرہ'' قرآن مجید کی تفسیر نہیں اور نہ اس کے لکھنے والے کو دعویٰ ہے مفسر ہونے کا اور محقق ہونے کا۔ یہ ''زلف برہم'' کی طرح چند تڑپتے حروف ہیں اور گریبان چاک کی طرح چند پیچان لفظ ہیں، جو کتاب رحمت کا فہم چاہنے والے ایک بے تاب دل کی آرزو ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ تبصرہ لکھنے والے نے خاصہ زمانہ مشاہیر علماء کے جوتے اٹھائے لیکن سند لے کر جب بازار علم میں قدم رکھا تو حاملین علم ودانش کی خود ساختہ رسوم نبھانا خاصی دشوار محسوس ہوئیں۔ فیصلہ یہی کیا کہ انجان ہونے کی منزل تلاش کی جائے۔ اب تو بس متاع آخرت ''ہیچ نمیدانم'' ہی قرار دے دی گئی۔ سیاست کے میدان میں اترا تو دنیا پرستی سے وفا ممکن نظر نہ آئی، لکھنا شروع کیا تو مروجہ صحافت کی زرد نگاریوں تک رسائی بال ہما ثابت ہوئی۔ زندگی نے آواز ماری تم اس دنیا کے نہیں۔ مادی وجود کی سیاہ چادر پھاڑ ڈالو شاید فردوس کے کسی روزن نور سے فہم وحقیقت اور آگہی وشعور کی کوئی کرن تمھارا مقدر بن جائے۔

اب صاحبو!

تبصرہ لکھنے والا کچھ بھی نہیں عالم نہ فاضل، ملا نہ حکیم، ادیب نہ خطیب، امی ان پڑھ انجان لیکن اس کی کوشش یہ ہے کہ کھلی آنکھوں سے قرآن پڑھے، گہری سماعت سے قرآن سنے، عمیق ذہن سے قرآن میں غور وفکر کرے اور مخلص ارادوں سے قرآن پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔ اس سفر میں قرآن پڑھتے ہوئے جس مفہوم پر اس عاجز مسافر کا دل جھوم اٹھا اور بزرگوں کی تائید بھی پائی تو اسے ٹوٹے پھوٹے انداز میں محفوظ کر دیا۔ ''یہی تبصرہ ہے''۔

قرآن کی راہوں سے گزرتے ہوئے تبصرہ نگار نے ہمیشہ اس اعتقاد کا چراغ روشن رکھا کہ اللہ وحدہ لاشریک منزہ عن العیوب ہے اور محمد ﷺ معصوم عن الخطا ہیں اور اسلام دین حق ہے اور قرآن اٹل ضابطہ حیات ہے۔ ''معاذ''

انسانوں کی سچی منزل ہے۔

اگر کوئی شخص تبصرہ پڑھتے ہوئے محسوس کرے کہ ''راقم ہیچ مدان'' کا کوئی لفظ اس کے اس عقیدہ کا ساتھ نہیں دیتا تو مغفرت کی دعا کرے اور درستگی کی کوشش کرے۔

نیکی جہاں بھی ہو اور جو بھی کرے اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی سے ہوتی ہے لیکن وہ احباب اور دوست بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں ہوتے جو نیکی کی راہ میں نصرت اور تعاون سے نوازتے ہیں۔ جناب محترم میاں محمد شریف (چیئرمین اتفاق گروپ آف انڈسٹریز) محمد احمد، سید کبیر حسین شاہ ہمدانی، محمد بہاؤالدین، محمد ارشد، حافظ سجاد احمد، مولانا سراج سعیدی، ڈاکٹر ظفر اقبال نوری، سید طاہر رضا بخاری اور سید اے شیخ۔ سب کرم فرماؤں کو اللہ رب العزت جزائے نور وسرور عطا فرمائے اور نیکی کی توفیق مزید سے نوازے۔

رب کریم اپنے عاجز بندے کو معاف فرمانا اور تبصرہ پڑھنے والے طالبان حق کی آغوش کو رحمتوں کے موتیوں سے مالا مال فرمانا۔

سید ریاض حسین شاہ

بسم الله الرحمٰن الرحيم

الحمد لله الذى نزل الفرقان على عبده ليكون للعلمين نذيرا و اطلع فى سماء النبوة سراجا لا معا و جعل دعوة نبيه قولا كريما و اطلع من اكمام الرسالة ثمرايا نعا و من على المومنين اذ بعث فيهم رسولا يتلوا عليهم آياته و يزكيهم و يعلمهم الكتاب والحكمة اظهره فى فلك العظمة قمراً منيرا والشكر لله الذى اوجد الانام من العدم وله الكبريا والثنا والاسماء الحسنى الله اكبر وهو المستعان وله الحول والقوه سرمد انعم المولى والوكيل ولنصير مؤيدا الله اكبر اسمه عروة الوثقى لانفصام لها ابدا تبارك الذى ادبنا بكتابه و بهذب اخلاقنا بسيرة حبيبه رب المشارق والمغارب خلق كل شئى وارسل رسوله الى كا فة الناس بشيرا ونذيرا و نزل روحه على قلبه و قال ان هذا القرآن يهدى للتى هى اقوم و دعانا الى الكلام فيه حمٰ والروطهٰ و يٰس و اشهد ان لااله الا الله وحده لا شريك له الها واحدا احدا صمدا لم يلد و لم يولد و لم يكن له كفواً احد والصلوٰة والسلام على عبده المبعوث بالقرآن العظيم والدين القويم والصراط المستقيم والمنهاج المتين و نبيه المنطوق ما ضل و ما غوى وما ينطق عن الهوى ان هو الا وحى يوحى و رسوله السامع صريف الاقلام بالمستوى و كتب الرحمن اسمه على العرش اذا استوى وحبيبه صاحب السرى من الحرم الى الاقصى ثم دنا فتدلى و محبوبه القائد فى الدنيا الى السعاده والحرية و فى الاخره الى مغفرة من الله و رضوان وخليله السائق الى النور والهدى و رفيقه العائذ من الذل والشقا واشهد ان محمدا عبده ورسوله و دينه دين الحق و صراطه صراط الحق و به يشهد الاصحاب والابرار و يعتقدون بكتابه انه سفر السعاده و قانون الفضيله و دستور العداله فى كل زمان و مكان لا ياتيه الباطل من

بين يديه و لا من خلفه تنزيل من حكيم حميد منان اللهم صلى و سلم و ترحم و تحنن على من سلم عليه الحجر والشجر اللهم صل وسلم و بارك على من كان ينا غيه فى مهده القمر اللهم صل وسلم وبارك على من قرء القرآن من العشاء الى الفجر و دعا الامم من العرب الى العجم اللهم صلى وسلم و بارك و ترحم و تحنن على عبدك و رسولك و حبيبك وعلى آل عبدك و اصحاب رسولك و احباب حبيبك اجمعين

اما بعد

فاعوذ با لله من الشيطن الرجيم

بسم الله الرحمٰن الرحيم

يٰس والقرآن الحكيم انك لمن المرسلين

على صراط مستقيم

سورہ یٰسٓ

پیغمبر حسن ورحمت حضرت محمد ﷺ کے سینہ نور پر مکی زندگی میں نازل ہوئی

اس کی تیراسی(83) آیات اور پانچ(5) رکوع ہیں۔

حروف کی تعداد تین ہزار(3000) اور کلمات سات سوانتیس(729) ہیں۔

یٰس

یہ سورۂ مبارکہ نزول کے اعتبار سے رسالت مآب ﷺ کی مکی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ اس کی ہر آیت ''نون'' پر یا ''میم'' پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ مختصر فاصلوں اور تیز سروں کے ساتھ ''نون'' اور ''میم'' پر آیت کا اختتام جیسے کوئی آبشار جام نما چشمہ میں گر رہی ہو اور تاثیر کے چھینٹے روحوں میں لطافت گھول رہے ہوں۔ آیات کی اثر آفرینی احساس پر مسلسل چوٹیں مارتی نظر آتی ہے۔ ''و،ن'' اور ''ی،ن'' کا سجع کانوں میں کچھ ایسا رس گھولتا ہے کہ ضمیر خود بخود بیداری کے لئے انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔ ''و،م'' اور ''ی،م'' کا مسلسل اور متواتر استعمال جیسے پیغام محمدی کے بوسے لے رہا ہو۔ ہر حرف گویا ''ن'' کے منہ سے نور بکھیرتا ہے اور ہر آیت ''م'' کے چہرے سے حسن چینی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہر چیز کا دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل یٰس ہے۔''

سبحان اللہ!

یٰس دل ہے

سبحان اللہ!

یٰس قرآن کا دل ہے۔

سبحان اللہ!

یٰس پیغام محمدی ﷺ کا دل ہے۔

سبحان اللہ!

یٰس اعتقاد سازی کی اساس ہے۔

سبحان اللہ!

یٰس آخرت سازی کی بنیاد ہے۔

سبحان اللہ!

یٰس رحمتوں کا سرچشمہ ہے۔

سبحان اللہ!

یٰس انوار کا مصدر ہے۔

سبحان اللہ!

یٰس معرفت الٰہیہ کی مئے گلگوں ہے۔

سبحان اللہ!

یٰس مفاہیم کی جنت گاہ ہے۔

سبحان اللہ!

یٰس دعوات خیر کی نکہت سرور نواز ہے۔

سبحان اللہ!

یٰس پیغام حق کا اثر تقدیر بدل ہے۔

سبحان اللہ!

یٰسٓ ﴿۱﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳﴾

وہ نغمہ، وہ گیت اور وہ پیغام ہے جو روحوں میں بستا ہے، دلوں میں اترتا ہے، دماغوں میں گھر کرتا ہے۔ رگوں میں گردش، سینوں میں حرارت اور ایمانوں میں ارتعاش پیدا کرتا ہے۔ الجھے ہوؤں کا دل چاہتا ہے کہ وہ سلجھ جائیں، بھٹکے ہوئے مائل ہوتے ہیں کہ راہ ہدایت میسر آجائے اور مردہ ہڈیوں میں بھی گویا زندگی رقص کرنے لگ جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اسے اپنے اموات پر پڑھا کرو“۔۔۔ اسے اموات پر پڑھا کرو اس لئے نہیں کہ وہ مر جائیں اس لئے کہ وہ جی جائیں۔ مرتا تو وہ ہے اور مردہ تو وہ ہوتا ہے جس کے خمیر خاک میں توحید پرستی کا جوہر نہ ہو اور اس کے دیدۂ

بے تاب میں جمال رسالت مآب ﷺ کو دیکھنے کی تڑپ نہ ہو۔ اس کے رشک گلاب لبوں پر کلام الٰہی کی سریں نہ جاری ہوئی ہوں۔ قرآن پر اس کا ایمان نہ ہو۔۔۔ توحید کو وہ مانتا نہ ہو۔۔۔ دنیا کو اندھیر تصور کرتا ہو اور معاد پر یقین نہ رکھتا ہو۔ سورۂ یٰسں مردوں کے پاس پڑھا کرو یا لب موت پہنچنے والوں کے پاس پڑھا کرو اس لئے کہ یہ مبارک سورت زندگی بخش اور حیات آفرین ہے۔ دم نزع اموات کو سناؤ شاید کہ کوئی سن کر اسے مان لے اور پھر اپنی قبر کو قطعہ جنت بنا لے۔

لسان رحمت فروغ ﷺ سے ایک مرتبہ یہ الفاظ بھی نکلے کہ

''جو شخص سورۂ یٰس کو آخرت کے ارادے سے پڑھتا ہے اسے بخش دیا جاتا ہے''۔

ایک حدیث میں ہے کہ '' یٰس لما قرات له'' یٰس کو جس مقصد کی خاطر پڑھا جائے وہی حاصل ہوگا۔

علامہ سہیلی نے سورۂ یٰس کے فضائل میں یہ بات بھی نقل کی ہے کہ

''جو کوئی یہ سورت پڑھتا ہے بیمار ہو تو شفاء، خائف ہو تو امن اور بھوکا ہو تو شکم سیری حاصل کر لیتا ہے''۔

دارمی کی روایت کے مطابق'' جو شخص یہ سورت صبح پڑھتا ہے شام تک اور جو رات میں پڑھتا ہے وہ صبح تک شاداں وفرحاں رہتا ہے''۔

حضرت انس ؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ حضور انور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص ایک مرتبہ سورۂ یٰس پڑھتا ہے اسے دس مرتبہ قرآن مجید پڑھنے کا ثواب ملتا ہے''۔

قارئین کرام!

دامن دل کھولو اور یٰـــس کے لالہ زاروں سے حسن و جمال سمیٹ لو۔ اس وادی نور میں کھلنے والا ہر پھول سرور نواز ہے اور اس کی عطر بیزیاں فردوس کی لطافتیں بکھیرتی ہیں۔ یہاں معرفت الٰہی کی وہ مے بٹتی ہے کہ بادہ فروشانِ دنیا کو اپنے وجود تک کی خبر نہیں رہتی۔ معنوں کے چہروں سے جب حروف کے نقاب سرکتے ہیں تو یٰـس کا ایک ایک لفظ پیکر نور، پیکر رعنا اور پیکر حسن رسالت مآب ﷺ کا مظہر بن جاتا ہے، پھر وہی ہوتے ہیں، وہی بولتے ہیں، وہی بلاتے ہیں، وہی سمجھاتے ہیں اور وہی دیکھتے دیکھتے نگاہوں کا مطاف، دلوں کا قبلہ اور سوچوں کا محور بن جاتے ہیں۔ یوں یٰـس پڑھنے والا قاریٔ قرآن نہیں رہتا، رحمٰن کا بندہ اور رسول نور ﷺ کی دہلیز کا خادم بن جاتا ہے، اسی لئے حضور انور ﷺ نے ارشاد فرمایا

کہ ”میرا دل چاہتا ہے کہ یٰس میری امت کے ہر فرد کے سینہ میں محفوظ ہو جائے“۔

سورۂ یٰس کا عرفانی اسلوب اور انسانی تربیت کا وجدانی انداز پڑھنے والوں کو صرف اس بات پر آمادہ ہی نہیں کرتا کہ شیطان کی عبادت نہ کی جائے بلکہ عزم و ہمت کی محکم رسیوں میں اس طرح جکڑ لیتا ہے کہ شیطانی قوتیں نہایت مکروہ دکھائی دینے لگ جاتی ہیں اور زندگی کے متنوع گوشوں میں محض قرآن، اسلام، رسالت اور خشیت باری کا نور جگمگانے لگتا ہے اور احتساب کا خوف اصلاح کا محرک بن کر سیرت و کردار کی نگہبانی کا تقدس مآب فریضہ سرانجام دینے لگتا ہے۔

یٰس شریف میں ہر وہ مواد موجود دکھائی دیتا ہے جو کسی بھی طرح کے غافل اور بے خبر انسانوں کو بیدار مغز بنانے میں مدد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

آیئے! دیکھتے ہیں اسلام کے اس قصر رفیع کو جس کے فلک بوس مینار یٰس شریف کی چھم چھم برستی بارش میں برق وحی کے اُجالوں سے نہایت نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

سورۂ یٰس کے بحر نور میں غوطہ زنی کرنے والے احباب کرام!

سورت کی تفسیر جس گنہگار شخص کے لرزتے قلم سے ٹپکی اس نے ہر آیت کی دل ہلا دینے والی تنبیہات نقل کرنے سے پہلے نورانی و روحانی ماحول کی تلاش میں سید علی ہجویری کے قدموں میں حاضری دی اور جب کوئی آیت اپنی تفسیر کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی، حرم ہجویری میں حاضری ہوئی، محض اس لئے کہ اعتراف عجز اور اعتراف خطا و نسیان ہو جائے۔ اللہ جل و علیٰ روحانی لوگوں کے صدقے معاف فرمائے۔

آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ و آلہ و اصحابہ اجمعین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰسٓ ۚ ﴿١﴾

وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ ﴿٢﴾

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ ﴿٣﴾

عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ؕ ﴿٤﴾

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ ﴿٥﴾

یاسین (۱)

قسم قرآن حکیم کی (۲)

شک نہیں آپ ضرور رسولوں میں سے ہیں (۳)

سیدھی راہ پر ہیں (۴)

(یہ قرآن) نازل کیا ہوا ہے عزت والے مہربان کا (۵)

مفردات

یٰسٓ ۝۱

''یٰس''، محض ایک کلمہ نہیں بلکہ معانی ودقائق اور مفاہیم وحقائق سے لبریز ایک بحرِ بے پایاں ہے۔ جس کی وسعتوں کا اندازہ نذرالفاظ نہیں کیا جاسکتا۔حضرت قتادہ ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ اسمائے قرآن میں سے ہے(1)۔علی بن ابی طلحہ کے بقول یہ اللہ سبحانہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے (2)۔ابن حنفیہ، ضحاک، حسن بصری اور سفیان بن عینہ کہتے ہیں کہ''یٰس'' کا معنی ''یاانسان''یا''یارجل'' ہے یعنی ''اے انسان''یا''اے شخص''۔سعید بن جبیر،عکرمہ اور ابن عباس ﷺ کا نظریہ بھی یہی تھا(3)۔حضرت امام جعفر صادق ﷺ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد حضور انور ﷺ کی ذات مسعود ہے۔ابوبکر وراق کے خیال میں بھی''یٰس'' ''یا سید البشر'' کا مخفف ہے۔۔۔!!

علامہ آلوسی نے اس حسین، دلآویز، جمال پرور، کیف آور اور معنی افروز کلمہ پر جن لطیف خیالات کا اظہار فرمایا قابل ملاحظہ ہیں۔آپ فرماتے ہیں کہ''رسول اکرم ﷺ کی ذات مسعود اس کائنات کا دل ہے اور آپ ﷺ نے اس پاک سورت کو بھی قرآن کا دل قرار دیا ہے گویا اللہ کریم نے قرآن کے دل کا آغاز ساری کائنات کے دل کے ذکر سے کیا''(4)۔۔۔!!

حروف مقطعات پر تمام مفسرین کی آراء کو اگر دقت نظر سے دیکھا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کر لینا مشکل نہیں رہتا کہ ہر حرف سے اسلام کے اصول ثلاثہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی توحید باری جس کا عرفان ذات وحدہ لاشریک کی صفات ہی سے ممکن ہے، رسالت محمدیہ ﷺ اور حقانیت قرآن۔ہمارے خیال میں جملہ حروف مقطعات میں انہی تین باتوں کا اعادہ کیا گیا ہے اور یہی ہمارے دین کی اصل ہے(5)۔

حضور انور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اس شخص نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا جو راضی ہو گیا اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے رسول ہونے پر''۔

وَالۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ ۝۲ اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۝۳

''قسم قرآن حکیم کی، شک نہیں آپ ضرور رسولوں میں سے ہیں''۔

رسول اکرم ﷺ نے مردہ انسانی معاشرے کے اندر جب اصلاح اور فلاح کی کامیاب اور نتیجہ خیز تحریک اٹھائی تو ضرورت اس امر کی تھی کہ لوگ اپنے بھکے ہوئے افکار کو ترک کریں اور زندگی گذارنے کے لیے ٹیڑھی اور ناہموار پگڈنڈیوں کو خیرباد کہتے ہوئے صاف ستھرے اور سیدھے راستے کا انتخاب عمل میں لائیں۔اس اہم اور زبردست انقلابی اقدام کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ دوٹوک اور واضح انداز

وَ: حرف قسم اور قرآن مقسم بہ بمعنٰی ''قسم'' ہے بعض علماء نے قرآن کو''یٰس'' کا معطوف علیہ بھی قرار دیا ہے۔ترجیحی قول پہلا ہے

وَالۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ: قسم حکمت والے قرآن کی

اِنَّ: حرف تاکید بمعنے بے شک

کَ: ضمیر مخاطب بمعنٰی آپ

اِنَّکَ: بے شک آپ

مِنۡ: سے

الۡمُرۡسَلِیۡنَ: مرسل کی جمع یعنی رسول

مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ: رسولوں سے

میں حضور ﷺ انسانی قیادت کے نام نہاد اور خود ساختہ دعویداروں کے بے تیل سفالی دیئے توڑ دیتے اور ان کی جگہ صداقت مآب اور امانت افروز نور کے حامل چراغ روشن فرماتے۔ آپ ﷺ نے پوری ہمت، شجاعت اور استقامت کے ساتھ سوز قرآن میں ڈوب کر اس طرح دردمندانہ انداز میں نور نوازی فرمائی کہ لوگوں کی پرانی، بہکی، گمراہ اور بوسیدہ سوچیں متزلزل ہونے لگیں۔ حق کے جویا لوگ اپنی آنکھوں کے سامنے عزائم اور اعمال کا ایک جہان تازہ محسوس کرنے لگے۔ چراغ مصطفوی کی یہ روشن اور تاباں کرنیں ڈھیٹ اور ہٹ دھرم لوگوں کو پسند نہ آئیں اور وہ رسول اکرم ﷺ کی رسالت ہی کے منکر ہونے لگے۔ اس موقع پر کائنات کے پالنہار کو منکرین کی روش پسند نہ آئی اور اس نے حکمت مآب قرآن کی قسم اٹھا کر کہا کہ اے محبوب ''اس میں کیا شک ہے کہ آپ رسولوں میں سے ہیں'' چاند کی طرف منہ کر کے تھوکنے سے چاند کا کیا بگڑتا ہے، چھینٹے اپنے ہی منہ پر پڑتے ہیں۔

کتنا کیف ہے ان آیات میں
اور کتنا ایمان افروز ہے یہ انداز کہ
خود خدا، خدا ہو کر اپنے محبوب رسول کو مخاطب کر رہا ہے۔
محبوب رسول!
پیارے رسول!
سردار رسول!
پیشوا رسول!
یا۔۔۔!!
سین۔۔۔!!

غم نہ کھا، تسلی رکھ، کوئی انکار کرتا ہے تو کرنے دے، تیرا رب خود تیری رسالت کا گواہ ہے۔ وہ خود اپنے محبوب، پیارے، عظیم اور حکیم قرآن کی قسم اٹھا کر کہہ رہا ہے کہ '' آپ یقیناً رسولوں میں سے ہیں''۔

عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

''سیدھی راہ پر ہیں''۔

صراط مستقیم کیا ہے؟

لغوی اعتبار سے صراط کا معنی راستہ اور مستقیم کا مطلب سیدھا ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے ہدایت ربانی کے لئے '' صراط مستقیم ''کی حسین تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ ربانی ہدایت کا سب سے بڑا اور اہم اطلاق چونکہ حضور انور ﷺ کی ذات اطہر پر ہوتا ہے، اس لئے رب کائنات نے رسول اکرم ﷺ

مفردات

عَلٰى: حرف ''جر'' بمعنی اوپر یا ''پر''

صِرَاطٍ: راستہ۔ صراط کی اصل ''صرط'' ہے، جس کا لغوی معنی '' نگل'' لینا ہے۔ راستہ بھی چونکہ انسان کو پوری طرح اپنا لیتا ہے، اس لیے اسے صراط کہہ دیتے ہیں

مُّسْتَقِيْمٍ: سیدھا

کومخاطب کر کے ارشاد فرمایا کہ ''اس میں شک نہیں کہ اے محبوب! آپ رسولوں میں سے ہیں اور سیدھی راہ پر ہیں''۔ یادرہے کہ یہاں قرآن حکیم نے ''سیدھی راہ'' کا تعارف کرایا کہ سیدھی راہ وہ ہے جس پر پیغمبر رحمت ﷺ ہوں۔ معنی یہ ہوا کہ ایسی سوچیں، ایسے اعمال اور ایسے افکار جن میں رسول اکرم ﷺ نے فکر وعمل کی جو بھی راہ عطا فرمائی اس میں نہ تو بوجھل عقیدے ہیں اور نہ نا قابل برداشت اعمال، نہ معمے نہ پہیلیاں، نہ الجھنیں نہ پیچیدگیاں، نہ مشکلیں نہ مصائب، سادگی اور سلاست، واضح، صاف اور اطمینان بخش۔ چاہو تو اصول دیکھ لو جو رسول اکرم ﷺ نے عطا فرمائے اور چاہو تو آپ ﷺ کی سیرت دیکھ لو، کسی میں بھی اعواج نہیں، تخریب نہیں، خم نہیں اور ٹیڑھا پن نہیں۔ ہر ایک کی ضوریزیاں اور نور افروزیاں منزل تک رسائی کی ایک عظیم، سیدھی، صاف اور مستقیم شاہراہ عطا کرتی ہیں اسی کو قرآن حکیم صراط مستقیم قرار دیتا ہے اور اسی کی طرف رسول کریم ﷺ قرآن کی زبان میں ارشاد فرماتے ہیں:

''اور یہ میری راہ ہے بالکل سیدھی پس اس پر چلو اور طرح طرح کی راہوں پر نہ چلو وہ تمہیں راہ حقیقی سے جدا کر دیں گی وہ اسی بات کا تمہیں حکم دیتا ہے تا کہ تم پرہیزگار بنو''۔

قرآن پڑھنے والو!

کتاب انقلاب کی عطر بیزیوں سے مستفید ہونے والو!

اگر تمھارے ذہن ٹیڑھے نہیں اور تم میں منزل تک رسائی کی جستجو موجود ہے۔

تو آؤ! تمہیں ایک ذات بتاؤں جس سے وابستگی ہی میں معرفت الٰہیہ تک پہنچنے کے لئے سیدھی راہ نکلتی ہے۔ پس ان کی رسالت سے انکار نہ کرو۔ ان کا سیدھی راہ پر ہونا ہی ان کے عظیم قائد ہونے کی روشن، تاباں اور نا قابل شکست دلیل ہے۔ بے شک وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جو اللہ کے سچے اور عظیم رسول ہیں۔

تَنۡزِیۡلَ الۡعَزِیۡزِ الرَّحِیۡمِ ○

''(یہ قرآن) نازل کیا ہوا ہے عزت والے مہربان کا''۔

انسان ہمہ دم اس بات کا محتاج رہتا ہے کہ اسے معصوم، نور پرور اور منزل آگاہ قیادت میسر آئے جس سے وابستہ ہو کر وہ اپنی ظاہری، باطنی، فکری اور عملی درماندگیاں دور کرے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ کوئی قیادت اس انسانی احتیاج کو اس وقت تک ختم نہیں کر سکتی جب تک کہ اسے الہامی اور ربانی رہنمائی حاصل نہ ہو اور یہ بھی کہ پھر اس ربانی ہدایت کے سائے میں زندگی کا لائحہ عمل اور پروگرام واضح نہ ہو۔ سورۂ یٰس کا ابتدائی حصہ دراصل انسانوں کی اسی فطری پیاس اور تشنگی کو بجھانے کا ایک زبردست ربانی اہتمام ہے۔ جس میں پوری صراحت کے ساتھ یہ امور طے کر دیئے گئے۔

تَنۡزِیۡلَ: باب تفعیل۔ آہستہ آہستہ اُتارنا۔ (الطائف اللغتہ) خبر مبتدا مقدر مرفوع عند اھل المدینۃ ومنصوب بر تقدیر اقرء تنزیل العزیز الرحیم یا امدح تنزیل ہر دو صورتوں میں منصوب۔ (جلالین۔ ایسر التفاسیر۔ تفسیر کبیر) ''قرآن'' سے بدل ہونے کی صورت میں مجرور بھی پڑھا جا سکے گا

الۡعَزِیۡزِ: ''العز'' شدت اور غلبہ، اقتدار اور طاقت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور ''عز'' کا معنی ہو گا وہ قوی ہوا

الرَّحِیۡمِ: رحم کرنے والا مہربان بروزن فعیل

مفردات

پہلا یہ کہ انسانی رہنمائی رسول ہی کر سکتے ہیں اور محمد ﷺ اللہ کے پیارے رسولوں میں سے ہیں، گویا انسانوں کو انتخاب قیادت میں اضطراب میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ پوری دلجمعی، یکسوئی اور ایمان وایقان کے ساتھ مصطفیٰ کریم ﷺ کا دامن پکڑ لینا چاہئے۔

دوسرا یہ کہ اچھی قیادت وہی ہوتی ہے جو منزل تک پہنچنے کے لیے صاف اور سیدھے راستہ کا تعین کرے اور پھر اس راہ پر چلنا اپنی خداداد صلاحیتوں کے ساتھ آسان کر دے۔ اس اعتبار سے بھی اس میں کیا شک ہے کہ مصطفیٰ کریم ﷺ ہی سیدھی راہ پر ہیں بلکہ سیدھی راہ کا عرفان انہی کے وسیلے سے ممکن ہے۔

تیسرا یہ کہ کامیاب قیادتیں وہی ہوتی ہے جو زندگی گزارنے کے لئے فلاح وصلاح کا مضبوط پروگرام رکھتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے وابستگان رسول کریم ﷺ کی کتنی خوش قسمتی ہے کہ ان کی زندگی کے خاکوں میں سکون کا نور نور رنگ بھرنے کے لئے رب مصطفیٰ کریم ﷺ نے انہیں قرآن حکیم عطا فرما دیا جس کی شان، حکمت اور اعجاز سے اندھے بھی انکار نہیں کر سکتے۔

اور چوتھا یہ کہ جو کچھ مصطفیٰ کریم ﷺ نے دیا وہ ان کا اپنا وضع کردہ اور خود تراشیدہ نہیں بلکہ عزیز اور رحیم ذات کا اتارا ہوا کلام بلاغت نظام ہے۔

کتاب حکمت پڑھنے والوں پر فہم بلیغ کی گل پاشیاں کرنے کے بعد بتایا گیا:

کہ قرآن پڑھنے والو! تمہیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ اس عظیم کتاب کو اتارنے والا عزیز بھی ہے اور رحیم بھی۔ دیکھتے نہیں ایک مدت مدید گزرنے کے باوجود اس کے حروف وکلمات تک محفوظ ہیں۔ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ اس کا نازل کرنے والا بڑا غالب اور عزیز ہے اور رحیم اتنا کہ قرآن ایسی عظیم نعمت انسانوں کو عطا فرما دی اور یہ بھی کہ عزیز کہنے میں منکرین حق کے لئے تہدید ہے اور رحیم کہنے میں راہ حق قبول کرنے والوں کے لئے خوشخبری اور بشارت ہے۔

۞۞۞۞۞

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝٦
لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٧
اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝٨
وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝٩
وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝١٠

تا کہ آپ ڈرائیں اس قوم کو کہ نہیں ڈرائے گئے جن کے باپ دادا، اس لئے وہ بے خبری میں ہیں (٦)
قسم سے بات پوری ہو چکی ہے (ان میں سے) اکثر پر، سو وہ نہیں مانیں گے (٧)
بے شک ہم نے ڈال دیئے ہیں ان کی گردنوں میں طوق جن سے وہ ٹھوڑیوں تک کسے ہوئے ہیں اسی لئے تو وہ سر اٹھائے رہنے والے ہیں (٨)
اور بنا دی ہم نے ان کے سامنے ایک آڑ اور ان کے پیچھے ایک آڑ، سو ہم نے انہیں ڈھانپ لیا پس وہ دیکھ نہیں پاتے (٩)
اور یکساں ہے ان کے لئے (محبوب) آپ ڈرائیں انہیں یا نہ ڈرائیں انہیں، ایمان نہیں لائیں گے (١٠)

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝۶

''تا کہ آپ ڈرائیں اس قوم کو کہ نہیں ڈرائے گئے جن کے باپ دادا، اس لئے وہ بے خبری میں ہیں''۔

قوموں کے لئے سب سے بڑا اور مہلک مرض غفلت ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب کوئی معاشرہ، سماج یا قوم اہداف زندگی سے نا آشنا ہو جائے تو روحانی الذہن لوگ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ حقائق سے بے خبری اور مدام غفلت بربادی اور تباہی کا مقدمہ ہوتا ہے، انہی وجوہات کی بنا پر ایسے لوگ ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں کہ غفلت کی ظلمت ختم ہو اور علم، حق بینی، صداقت پرستی اور راست روی کے چراغ روشن رہیں۔ اس کے برعکس غفلت دشمن اور جہالت سوز لوگ اگر دنیا میں نہ رہیں تو اس کا لازمی نتیجہ بے خبری اور خدا نا آشنائی کے اندھیروں کا پھیل جانا ہوتا ہے۔ انسانیت سازی اور احسان افزوئی کی تحریک اسی صورت میں جان پکڑ سکتی ہے جب کہ کچھ جلیل القدر ہستیاں سماج کا بگاڑ درست کرنے میں لگی رہیں۔ تعمیر انسانیت کا یہ عظیم کام جہاں اہم ہے وہاں از حد مشکل اور دشوار بھی ہے، اس لئے جب تک اللہ رب العزت کی تائید، قوت اور انتخاب شامل حال نہ ہو تو اس کام کا نبھانا ناممکن رہتا ہے۔ یقیناً یہی وجہ ہے کہ اللہ کریم ایسے برگزیدہ بندے مبعوث فرماتا رہتا ہے جو تائید الٰہیہ سے معاشرتی اصلاح کی روحانی بنیادیں مستحکم کرتے ہیں۔ مذہبیات میں انہیں عظیم لوگوں کو رسول کہا جاتا ہے۔ ان کے افکار کا مرکز نظر یہ توحید ہوتا ہے وہ لوگوں کے سامنے زندگی کا ایسا حسین تصور پیش کرتے ہیں جسے اختیار کرنے میں زحمت اور کلفت نہیں ہوتی بلکہ فکر فکر اور عمل عمل اطمینان کی جنتیں لئے ہوتے ہیں۔ یہ عظیم لوگ اللہ کے دیئے ہوئے نور کی روشنی میں جانتے ہوتے ہیں کہ کون سے اعمال خیر اور بھلائی کا نتیجہ دیتے ہیں اور کن اعمال کا ثمر بربادی ہوتا ہے۔ انبیاء اور مرسلین کی اسی دعوت کو قرآن مجید ''انذار''(6) سے تعبیر کرتا ہے۔ ''انذار'' کا لغوی معنی تو ڈرانا یا ڈر سنانا ہی ہوتا ہے لیکن قرآنی اصطلاح میں ''انذار'' خدا پرستی کے اصولوں پر خیر اور شر کے نتائج سے قوم کو آگاہ کر دینا ہوتا ہے۔ ''انذار'' کے معنوی نور سے نہ تو کوئی زمانہ خالی ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی خطہ۔ بندگان خدا شعور اور آگاہی کا یہ راحت بخش جام گردش میں رکھتے ہیں۔ اللہ کے پاک رسول اسی مقصد کی برآری کے لئے شبانہ روز مشقت اٹھاتے ہیں۔ سورۂ یٰس کی اس حسین اور بصیرت افروز آیہ کریمہ میں رسول کریم ﷺ کے اسی فرض منصبی کی طرف اشارہ کیا گیا کہ اے محبوب ﷺ ہم نے آپ کو قرآن اسی لئے دیا ہے تا کہ آپ اس کے جامع، ٹھوس، لازوال اور اعجاز آفرین اصولوں کی روشنی میں اپنی قوم اور ملت کو آگاہ کریں کہ منزل کی طرف جانے والا سیدھا راستہ وہی

مفردات

لِتُنْذِرَ: مجموعہ ''ل'' و ''تنذر'' از باب فعال، بمعنٰی ڈرانا یا احتیاط کرنے کا حکم دینا۔ اچھے بُرے کی تمیز پیدا کرنا یا نتائج اعمال سے آگاہ کرنا (لسان العرب)

قَوْمًا: قوم

مَّآ: جمہور کے نزدیک نافیہ ہے، معنٰی نہ یا نہیں۔ بعض علماء کے نزدیک یہ موصولہ منصوبہ بھی ہوسکتا ہے۔ در معنٰی ''جو'' اور مصدریہ لانا بھی ممکن ہے۔ (مدارک التنزیل)

اٰبَآؤُهُمْ: ان کے باپ دادا

فَهُمْ: پس وہ

غٰفِلُوْنَ: غفلت سے ہے جس کا لغوی معنٰی ڈھانپنا اور چھپا دینا ہوتا ہے۔ چھوڑ دینے اور بھول جانے کے معنوں میں اکثر استعمال ہوا ہے۔ بقول راغب اصفہانی کے غفلت ایسی بھول ہوگی جو احتیاط نہ کرنے کی بنا پر ہو (المفردات فی غریب القرآن)

ہے جس پر میں کھڑا ہوں۔ محبوب! آپ ان پر پوری طرح واضح کر دیں کہ اگر وہ اس سکون بخش جادۂ حق کو قبول نہیں کریں گے تو اس کا لازمی نتیجہ تباہی ہوگا۔

تفسیری اعتبار سے امام رازی(7) اور دیگر بہت سے مفسرین کرام نے اس آیۂ کریمہ کی تفسیر میں دو آرا نقل کی ہے:

ایک تو یہ کہ آیت میں واقع ہونے والا ''ما مصدری'' ہے۔ اس اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا کہ پیارے حبیب ﷺ آپ اس قوم کو اس چیز سے ڈرائیں جس سے ان کے باپ دادا بھی ڈرائے جاتے رہے اور دوسرا یہ کہ ''ما'' نافیہ ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اے محبوب! آپ اس قوم کو ڈرائیں جن کے ماضی قریب میں کوئی ڈرانے والا مبعوث نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ چار سو غفلتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ عام مفسرین نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

''قسم سے بات پوری ہو چکی ہے (ان میں سے) اکثر پر، سو وہ نہیں مانیں گے''۔

ایک داعی الی اللہ کی ذمہ داری یہ نہیں ہوتی کہ وہ طاقت اور قوت سے کسی کو اٹھائے اور راہ حق پر ڈال دے بلکہ اس کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماحول کو نور دعوت سے اس قدر ضوفشاں کر دے راہ حق پر چلنا آسان ہو جائے، البتہ داعی الی اللہ کی کوئی بات زور استدلال اور نور بلاغت سے خالی نہیں ہونی چاہئے۔ حضور انور ﷺ کو جو ذمہ داری سونپی گئی وہ یہ تھی کہ ''لتنذر'' یعنی آپ انذار بالقرآن فرمائیں۔ اب ''انذار'' کا تقاضا یہ تھا کہ حضور انور ﷺ کی زبان رحمت سے جو بات نکلے وہ اپنے منطقی، فکری اور روحانی ثمرات کے ساتھ پایہ ثبوت تک پہنچ جائے۔ رسول انور ﷺ نے جب دعوت دین دنیا بھر کے انسانوں کے سامنے رکھی تو آپ نے صاف طور پر یہ اعلان فرمایا کہ یہ ہیں وہ اصول جنہیں اختیار کرنے سے ''حسنہ فی الدنیا'' اور ''حسنہ فی الآخرۃ'' کی منزل میسر آتی ہے اور انہیں ترک کرنے سے ذلت، بربادی اور جہنم مقدر بن جاتے ہیں۔ رسالت مآب ﷺ کی تحریک اٹھنے کی دیر تھی کہ آپ کے مخاطبین دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک وہ تھے جو اپنی فطرت ہی میں حق و صداقت کے مشتاق تھے اور دوسرے وہ تھے جو ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی برت رہے تھے۔ ان پر رسول رحمت ﷺ کی کوئی نصیحت کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ شبنم کا حسن پھول کی پتی پر ہی محسوس کیا جا سکتا ہے پتھروں کی سخت سلیں حسن شبنم کی عکاس نہیں ہوا کرتیں۔ آپ ﷺ کی دعوت جو برکات رکھتی تھی منکرین حق اس کا صحیح اندازہ نہیں کر پا رہے تھے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ کتاب رحمت فروغ قرآن حکیم نے ''حق القول'' یعنی بات ثابت ہو چکی ہے کہہ کر رسول کریم ﷺ کے ''انذار'' میں جو ثمرات تھے ان کی طرف اشارہ کیا، یعنی وہ لوگ جنہوں نے

مفردات

لَقَدْ: بے شک

حَقَّ: پورا ہو جانا، محقق ہو جانا، پایہ تکمیل تک پہنچ جانا

الْقَوْلُ: بات (تفسیر حسنات) فاعل در جملہ

عَلٰٓى: اوپر، پر (حرف جر)

اَكْثَرِ: اکثر (مجرور)

هِمْ: ان کے

فَهُمْ: تو وہ

لَا: نہیں

يُؤْمِنُوْنَ: ایمان لاتے

فعل ماضی معروف صیغہ جمع مذکر غائب

اللہ رب العزت سے اپنا رشتہ منقطع کر کے بتوں کے سامنے ناصیہ فرسائی شروع کر دی گویا ہدایت ربانی ملنے کی تمام راہوں کو بند کرتے ہوئے انہوں نے استکبار اور غرور کی روش اختیار کر لی ہے۔ انہوں نے دلوں میں حق داخل ہونے کے تمام دریچے سختی سے بند کر دیئے ہیں اور پورے وثوق سے یہ طے کر لیا ہے کہ حالات جیسے بھی ہوں ہم نے دعوت قرآن قبول نہیں کرنی۔ ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ کی کوئی بات جھوٹی نہیں ہوتی اور اس کے رسول کی زبان سے نکلنے والا کوئی جملہ مہمل اور بے معنی نہیں ہوتا۔ اس نے کہہ جو دیا ہے اور اس کا یہ قول پختہ ہے کہ جو رسول رحمت ﷺ کی بات نہیں مانیں گے، ان کی اکثریت جہنمی ہوگی، وہ ضرور بالضرور یہ ذلت کا عذاب دیکھیں گے، انہیں دنیا کی کوئی قوت اس رودباری اور بربادی سے بچا نہیں سکتی، گویا قرآن کے اس نورانی حصے میں زور "فھم لا یؤمنون" پر نہیں جیسا کہ بعض مفسرین نے سمجھا ہے بلکہ سارا زور "حق القول" پر ہے۔

علامہ ابوحیان اندلسی کے قول سے مراد توحید کے مضامین لیے ہیں (8) اور ابن جریر نے قول سے ارشاد ربانی "لاملئن جھنم من الجنة والناس اجمعین" مراد لیا ہے (9)۔ اسی قول کو اکثر مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ اگر محولہ بالا چند سطریں غور سے پڑھ لی جائیں تو ہمارے نزدیک مفسرین کی آراء میں کوئی تفاوت نہیں رہتا۔

ترجمہ میں قسم کا استعمال آلوسی (10) اور رازی (11) کے قول پر ہے۔

"فھم لا یومنون" میں ف کو تفریعیہ اور تعلیلیہ دونوں طرح سمجھا گیا ہے۔ اس سے بہت باریک معانی مستفاد ہوتے ہیں لیکن ان کے بیان کا یہ موقع نہیں۔

اِنَّا جَعَلۡنَا فِیۡۤ اَعۡنَاقِہِمۡ اَغۡلٰلًا فَہِیَ اِلَی الۡاَذۡقَانِ فَہُمۡ مُّقۡمَحُوۡنَ ۸

"بے شک ہم نے ڈال دیئے ہیں ان کی گردنوں میں طوق جن سے وہ ٹھوڑیوں تک کسے ہوئے ہیں اسی لئے تو وہ سر اٹھائے رہنے والے ہیں"۔

سیدھی راہ پر چلنا اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے جب نظر سلامت ہو اور ہمہ دم راہ دیکھتی رہے۔ وہ لوگ جو خود آنکھیں موند لیں یا حالات انہیں کوربین بنا دیں۔ ان کے لئے جادۂ حق پر سلامتی سے چلنا دشوار ہوا کرتا ہے اور اگر کوربینی کے ساتھ اعصاب بھی تن جائیں، جمود ذہن بھی لاحق ہو جائے اور اس پر مستزاد کوئی قوت زنجیروں میں بھی جکڑ لے تو نہ صرف منزل تک رسائی ناممکن ہوتی ہے بلکہ راہ میں پیش آنے والے کسی کھڈ میں گرنے کے اندیشے بھی قوی ہو جاتے ہیں۔ سلجھے افکار در حقیقت منزل حق کی طرف جانے والے سلامتی کے راستے ہوتے ہیں۔ انبیاء اور داعیین الی اللہ پوری دردمندی کے ساتھ مخلوق کو ان راہوں پر چلانے کی فکر رکھتے ہیں اور جب کوئی شخص اپنی آنکھوں پر تعصب کی پٹی باندھ لیتا

مفردات

اِنَّا جَعَلۡنَا: بدل اشتمال ہے۔ "لقد حق القول" سے

جَعَلۡنَا: بنائے ہم نے

الجعل تکوین الشیٔ کسی چیز کا ہونا، کرنا یا بنانا

فِیۡۤ: حرف جار بمعنٰی "بیچ" جس کا مجرور "اعناق" ہے۔

اَعۡنَاقِہِمۡ: جمع "عنق" جس کا معنی گردن ہوتا ہے

اَغۡلٰلًا: "اغلال" کا واحد "غل" ہے اور اس کا مادہ "غ ل ل" ہے جس کی اصل کسی چیز کا درمیانی خلاء میں چلے جانا ہوتا ہے۔ "غِل" بالکسرہ دل میں چھپی ہوئی دشمنی کو کہتے ہیں۔ ابن عاشور "التحریر" میں لکھتے ہیں کہ "غُل" اس لوہے کے حلقہ یا طوق کو کہتے ہیں جو ہار نما ہوتا ہے۔ اسے جب گلے میں ڈالا جائے تو گردن پر وہ اس قدر بوجھ بڑھا دیتا ہے کہ گردن اکڑ جاتی ہے اور آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور ہاتھ اوپر کی جانب اٹھ جاتے ہیں۔ "غل" مطلق قیدی بنانے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور "غل یغل" اہل عرب خیانت کرنے کے معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں

اِلَی: طرف

ہے اور اپنے آپ کو حالات اور رسم ورواج کے بے رحم دباؤ کے سامنے شکست خوردہ بنا لیتا ہے، اسے غرض ہی نہیں رہتی کہ تعمیر حیات کا حقیقی مواد کون سا ہے، وہ سوچتا ہی نہیں کہ اچھے اور بُرے میں اور خیر اور شر میں فرق کیا ہوتا ہے، اسے ضرورت ہی نہیں رہتی کہ کس کی اطاعت سے راہ حق کا مشتاق بنے، اس کے ذہن میں خیال ہی نہیں گزرتا کہ رزم گاہ حیات میں اندھا بن کر رہنے سے تباہی اور ذلت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ وہ خواہشات کی وادیوں میں گھومنے والا نفس پرست انسان اپنے مستقبل ہی کو داؤ پر لگا دیتا ہے۔ وہ سورج دیکھتا ہے لیکن اس کی روشنی کا منکر ہوتا ہے، وہ بزم کواکب سے رس رس کر نکلنے والے نور کے نظارے موجود پاتا ہے لیکن اپنے شعور کو اس قدر نابینا بنا دیتا ہے کہ اس کے حواس تاریکیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے وہ موقع کہ فطرت کی تعزیریں اتنی سنگین ہو جاتی ہیں کہ اس شخص کے لئے اپنا تحفظ ناممکن ہو جاتا ہے، پھر کفر اور عناد طوق بن کر اس کے گلے میں معلق ہو جاتے ہیں۔ حسد، بغض اور بے ہودہ عادات زنجیریں بن کر اس کے پاؤں میں پڑ جاتی ہیں پھر وہ اپنے ہی بہکے افکار کی رسیوں میں جکڑ لیا جاتا ہے، اپنے ہاتھوں لٹا یہ انسان پھر تکبر اور نخوت ہی کی غذا سے زندہ رہتا ہے۔ اس کی اپنی شامت اعمال اس پر مسلط کر دی جاتی ہے۔ یہ ڈھیٹ اور ہٹ دھرم شخص پھر اتنا بد اخلاق، سوء فکر اور کج عمل ہو جاتا ہے کہ اس کی اکڑی گردن اس کے دیدوں کو یوں پھیر دیتی ہے کہ وہ حضور انور ﷺ ایسے عظیم قائد کی عظمت کا بھی مقر نہیں رہتا، حالات اور افکار کی انہیں بدحالیوں میں جس وقت کوئی شخص محصور ہو جاتا ہے، قرآن حکیم اس کی مثال دیتا ہے اور کتنی خوبصورت مثال دیتا ہے کہ ''دیکھو ایسے نہیں کہ ہم نے ان کی گردن میں طوق ڈال دیئے ہیں جنہوں نے انہیں ٹھوڑیوں تک کس لیا ہے اور پھر یہ گردن اٹھائے یوں ہی فضول پھرتے ہیں''۔ ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔

اس آیۂ کریمہ کے شان نزول میں مفتی احمد یار خان نعیمی صاحب بدایونی نے خزائن اور جمل کے حوالہ سے لکھا:

> ''یہ آیت کریمہ ابوجہل اور اس کے دو مخزومی دوستوں کے متعلق نازل ہوئی۔ ابوجہل نے قسم کھائی تھی کہ اگر میں محمد مصطفیٰ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھوں گا تو ان کا سر کچل دوں گا، جب اس نے حضور ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا تو بڑا پتھر لے کر حضور ﷺ کی طرف بڑھا، جب حضور ﷺ کے قریب پہنچا تو اس کے ہاتھ گردن سے چپک گئے اور پتھر ہاتھ سے لپٹ گیا۔ اس کا یہ حال دیکھ کر ولید ابن مغیرہ بولا کہ میں یہ کام کروں گا جب وہ پتھر لے کر چلا تو اندھا ہو گیا۔ حضور ﷺ کو نہ دیکھ سکا۔ تیسرا بولا کہ پتھر مجھے دو۔ وہ لے کر چلا تو اچانک بدحواس ہو کر الٹا بھاگا اور بولا ایک بڑا سانڈ بیل میرے آگے تھا اگر میں آگے

مفردات

الْاَذْقَانِ: جمع ذقن بمعنی ٹھوڑیاں

فَهُمْ: تو وہ

مُّقْمَحُوْنَ: اس کا مصدر ''اقماح'' ہے۔ قرآن مجید نے اسے یہاں اسم مفعول کے صیغہ میں استعمال کیا ہے۔ وہ شخص جس کا سر اوپر اٹھا ہو۔ ویسے اس اونٹ کو کہتے ہیں جو پانی کے لیے سر نیچا نہ کر سکے

بڑھتا تو مجھے مار ڈالتا" (12)۔اس آیت میں اس کا بیان ہے۔

قرآن مجید نے منکر حق کی جو تصویر اس آیۂ کریمہ میں پیش کی اس کا حسن بلاغت اور حقیقت دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ لفظ "مقمحون" میں غور وفکر کیا جائے۔

"مقمحون مقمح" کی جمع ہے اور "مقمح" عربی میں اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کا سر پیچھے کی جانب اس طرح جکڑ دیا جائے کہ وہ نہ نیچے دیکھ سکے اور نہ اوپر (13)۔گویا "مقمحون" وہ لوگ ٹھہرے جو اپنی سرمستیوں میں یوں سرگرداں رہتے ہیں کہ ہر چیز کو وہ اپنے ہی زاویۂ فکر سے دیکھتے ہیں وہ اس قدر خودستائی کے مرض کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں کہ انہیں رسول اعظم ﷺ کی باتیں بھی سمجھ نہیں آتیں۔ "العیاذباللہ"۔

اسی لفظ کا حسن حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک حدیث کے حوالہ سے یوں نقل فرمایا کہ آپ ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا اے علی! "تو اور تیرے ماننے والے اللہ کے سامنے خوشی خوشی پیش ہوں گے اور تمھارا دشمن تم پر اس طرح پیش کیا جائے گا کہ وہ معتوب ہوگا اور سر اٹھائے"۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے پھر اپنے ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے باندھ دیئے اور کہا کہ اقماح یہ ہے (14)۔

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝

"اور بنا دی ہم نے ان کے سامنے ایک آڑ اور ان کے پیچھے ایک آڑ، سو ہم نے انھیں ڈھانپ لیا، پس وہ نہیں دیکھ پاتے"۔

غور کیجئے!

ایک ایسا شخص ہو جو گلے میں طوق ڈال کر جکڑ لیا گیا ہو اس کی آنکھوں کو ڈھانپ دیا جائے، اس کے سامنے اور پیچھے دیواریں چن دی جائیں، اس کا سر اوپر کو اٹھا ہو، دل میں جاذب نظر نظاروں کو دیکھنے کی تڑپ بھی ٹھنڈی پڑ چکی ہو۔ایسا مردہ ذوق محصور انسان کیا دیکھ سکے گا؟ کائنات میں پھیلے حسن افروز تکوینی سلسلے اسے کیا ذوق عطا کریں گے؟ اسے تو اپنی اسارت کی اذیت ہی سکھ سے سانس لینے کی دولت سے محروم رکھے گی۔ایسا شخص محرومیوں اور شقاوتوں کی اس انتہا تک جا پہنچے گا کہ اس کا اپنا وجود ہی اپنی زندگی کا مدفن بن جائے گا۔قرآن مجید نے وہ شخص جو ایمان قبول نہیں کرتا اور اپنی غلط فہمی کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔اس کی مثال کس احسن انداز میں پیش فرمائی کہ "ایسے شخص کے گلے میں ہم طوق ہی نہیں ڈالتے بلکہ اس کے آگے پیچھے دیواریں بھی چن دیتے ہیں" اور پھر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ایمان سے محروم شخص نہ تو اس قابل ہوتا ہے کہ اپنی ذات میں غور وفکر کرے اور نہ ہی اس لائق کہ انفس و

مفردات

وَ: اور

جَعَلْنَا: فعل ماضی معروف صیغہ جمع متکلم بمعنی "بنائی ہم نے" اس کا مصدر "جعل" ہے۔قرآن مجید میں کثیر معنوں میں استعمال ہوا ہے۔"کون الشئی" کے علاوہ داخل کرنے وغیرہ کے لیے بھی قرآن مجید نے اسے استعمال کیا۔سیاق وسباق کے لحاظ سے استعمال کیا جائے گا

مِنْ: "سے" حرف جار

بَيْنِ: جدائی، ظہور، درمیان، بیچ، وصل اور علاقہ وغیرہ کے معنوں میں آتا ہے۔کبھی اسم اور کبھی ظرف استعمال ہوتا ہے۔اس کی اضافت اگر "ایدی" کی طرف ہو تو اس کے معنی سامنے اور قریب کے ہوتے ہیں۔مصدر اس کا "بان" ہے

مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا: ان کے سامنے

وَّ: اور

مِنْ: سے

خَلْفِهِمْ: ان کے پیچھے

سَدًّا: رکاوٹ، دیوار

بنیادی طور پر یہ لفظ شگاف بھر دینے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔کمی دور کر دینا بھی اس کا ایک معنی ہے۔متوازن، سیدھا اور برابر بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔"سدا" اس کی زبر کے ساتھ اور پیش کے ساتھ دونوں طرح مستعمل ہے

فَاَغْشَيْنٰهُمْ: سو ہم نے انہیں ڈھانپ لیا

فَهُمْ: تو وہ

لَا يُبْصِرُوْنَ: دیکھ نہیں پاتے

مفردات

آفاق میں پھیلے ہوئے دلائل سے منزل کی جستجو پیدا کر سکے(15)۔

آگے اور پیچھے دیواریں کھڑی کر دینے کا ایک معنی یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ ضابطۂ حق قرآن حکیم سے اپنے آپ کو جو شخص محروم کر لیتا ہے اس کے درمیان اور اخروی سعادتوں کے درمیان ایک آڑ کھڑی کر دی جاتی ہے اور جس وقت یہ حق دشمن شخص پیچھے دنیا کی فکر میں منہمک ہوتا ہے تو دنیا اور اس کے درمیان بھی ایک حجاب، دیوار اور آڑ کھڑی کر دی جاتی ہے۔ گویا فطرت کا یہ باغی شخص دنیوی اور اخروی دونوں قسم کی نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے(16)۔

یاد رہے کہ عام طور پر ضابطۂ حق کتاب انقلاب فرقان مجید سے بغاوت کرنے والے لوگ اور مصطفوی قیادت کے نور سے بھاگنے والے فراری دو وجوہات کی بنیاد پر ازلی بد بخت ہو جاتے ہیں: ایک انہیں ماضی کی روایات اور باپ دادا کی بھونڈی تہذیبیں اپنے پندار سے نکلنے نہیں دیتیں اور دوسرا مستقبل کے بارے میں مادی خواہشات انہیں راستگی اختیار کرنے سے مانع رہتی ہیں۔ کتاب حکمت ہر چند ایسے کج فہم اور بد اندیش لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ دیکھتے نہیں کہ ماضی میں ان کے باپ دادا کی غلط ارواش پر انہیں کس موذی عذاب میں مبتلا کیا گیا۔ وہ سمجھتے نہیں کہ مستقبل تو ہر زمانے اور ہر دور میں اہل خیر کی متاع سکھ ہوتی ہے۔ یہاں ضابطۂ صدق قرآن حکیم سے ہٹ دھرمی اختیار کرنے والے منکرین کو سوچنا چاہیئے کہ جب کوئی قوم ڈھیٹ ہو جاتی ہے اور اپنی کج ضدی پر مصر رہنے لگتی ہے تو پھر قرآن کہتا ہے کہ ان کے آگے پیچھے ہم نے دیواریں کھڑی کر دی ہیں، یعنی نہ تو وہ ماضی سے عبرت حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان میں غور و فکر کی وہ صلاحیت رہتی ہے کہ مستقبل کے نتائج پر دھیان دے سکیں(17)۔

ابن جوزی بغدادی نے آیۂ کریمہ سے ایک اور حسین اور جمالیاتی مفہوم اخذ کیا ہے، فرماتے ہیں:

> ”رسول اکرم ﷺ جب عربستان میں دعوت حق کا نور بکھیرنے لگے تو ان کے مقام محمود سے نا آشنا عناصر آپ کے جانی دشمن ہو گئے۔ قدم قدم پر آپ ﷺ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جانے لگیں، یہاں تک کہ ایک موقع پر انھوں نے چاہا کہ وہ مصطفٰے کریم ﷺ کو اذیت پہنچائیں تو مولائے کریم نے انھیں یوں مجوب اور بے بس بنا دیا کہ وہ مصطفٰے کریم ﷺ کو دیکھ نہ پائے، اس کیفیت کے لئے قرآن مجید نے دیواریں چننے کا خوبصورت استعارہ استعمال کیا ہے“۔ یہاں ان لوگوں کے لئے بھی تسلی کا پہلو ہے جو قرآنی دعوت کی مشعل روشن کرتے ہوئے مصائب و کرائب کا سامنا کرتے ہیں کہ اگر وہ اخلاص سے یہ کام نبھائیں تو ان کے تحفظ کی ضمانت اللہ کریم فراہم کرتے ہیں“۔

آیت کا مفہوم آگے پیچھے کا نہ رہنا بھی ہو سکتا ہے۔ ہماری بعض علاقائی زبانوں میں بھی یہ محاورہ

استعمال ہوتا ہے، یعنی کسی قابل نہ رہنا اور بے کار ہو جانا۔ اسی طرز کے مفہوم کی طرف ابن عاشور نے اشارہ کیا ہے(18)۔

ایمان سے محروم ازلی ابدی بد بخت لوگوں کی شقاوت بیان کرنے کے لئے یہی کافی تھا کہ کہہ دیا جاتا کہ ہم نے ان کے آگے پیچھے دیواریں چن دیں لیکن رب کریم نے اس پر ''فاغشینھم فھم لا یبصرون'' کا اضافہ بھی فرمایا اور مسند الیہ کو مسند فعلی پر مقدم کیا تا کہ رسول اللہ ﷺ کو اچھی نظر سے نہ دیکھنے والوں پر جاہل، کم فہم، کج اندیش، بے عقل اور نادان ہونے کا حکم قوی کر کے بیان کیا جائے اسی طرح ''جعلنا'' کا تکرار ان مردہ ایمان لوگوں سے اظہار نفرت اور تاکید حکم کے لئے ہے(19)۔

حضرت مجاہد اس مثال کو ان لوگوں کی کیفیت قرار دیا کرتے تھے جو ایمان اور انکار میں متردد ہوں اور سعید ابن قتادہ اس استعارے کا مفہوم مختلف گمراہیوں میں گھر جانا بیان کرتے تھے(20)۔

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝١٠

''اور یکساں ہے ان کے لئے (محبوب) آپ ڈرائیں انہیں یا نہ ڈرائیں انہیں ایمان نہیں لائیں گے''۔

اس آیۂ کریمہ میں رسول اکرم ﷺ کے انذار و دعوت کی تاثیر کا تذکرہ نہیں بلکہ منکرین حق اور متکبرین فی الارض کی وہ نفسیاتی حالت بیان کی گئی ہے جس کے تحت وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی عقل کو محجوب بنائے راہ دین سے دور ہو رہے تھے۔ اپنی شامت اعمال کی تاریکیوں میں وہ اس قدر غرق ہو چکے تھے کہ خیر و شر، نور و ظلمت اور پستی و بلندی میں ان کے لئے فرق کرنا دشوار ہو چکا تھا۔ ان کی حالت اس مریض کی سی ہو چکی تھی جو اپنے منہ کی سقامت کی وجہ سے کسی بھی چیز کا ذائقہ خوشگوار محسوس نہیں کرتا۔ وہ اس اندھے کی طرح بن چکے تھے جس کے لئے آفتاب اور ماہتاب اپنی تمام تر ضیاء پاشیوں اور نور مندیوں کے باوجود تاریک ہی ہوتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دعوت حق کا سامع کس وقت اس کیفیت کا شکار ہوتا ہے کہ اسے راہنما کی رہنمائی، راہبر کی رہبری، ناصح کی نصیحت، دردمند کی دردمندی اور مصلح کی اصلاح کچھ فائدہ نہیں دیتی۔ وہ احساس اور ذوق فہم اور سمجھ کے لحاظ سے اس قدر سفیہہ اور نا اندیش ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے برابر ہو جاتا ہے کہ چاہو تو غلاظت گاہ میں بٹھا دو اور چاہو تو کعبہ میں۔ اس کے لئے یکساں ہوتا ہے کہ وہ خانہ کفر میں چلا جائے یا طور سینا کی چوٹی پر۔ ہر حالت میں اس کا اندھا احساس ان لطافتوں سے نا آشنا رہتا ہے۔ جمود طبعی کا شکار منکر قرآن جس وقت نشہ انا اور مدہوشی اقتدار کا شکار ہو جاتا ہے اس کی آنکھ اپنی عظمتوں کے سوا کسی کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ اس کے کان اپنی ہی آواز میں رس محسوس کرتے ہیں۔ اس کا دماغ انا ولا غیری کے پندار میں ہر وقت گرفتار رہتا

مفردات

وَ: اور

سَوَآءٌ: اس کا مادہ ہے ''س وی'' مختلف ابواب اور اوزان میں معنوی اختلاف رکھتا ہے۔ اپنی موجودہ صورت میں دو چیزوں کے باہم دگر برابر ہونے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض جگہوں میں ''عدل'' بھی اس کا معنی ہوتا ہے۔ محاورۃً یکساں ہونے کے مفہوم میں لایا جاتا ہے

عَلَيْهِمْ: اوپر ان کے

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ: یہ پہلے جملہ کا نتیجہ ہے

ءَاَنْذَرْتَهُمْ: حرف استفہام آپ ڈرائیں ان کو حرف استفہام جسے عربی گرائمر میں ھمزہ تسویہ کہتے ہیں

اَمْ: یا جو ''واؤ'' کے معنوں میں ہے

لَمْ تُنْذِرْهُمْ: نہ ڈرائیں ان کو

لَا يُؤْمِنُوْنَ: ایمان نہیں لائیں گے

مفردات

ہے۔اس کے دل کے پردوں پر ہر لحظہ غیر اللہ کی تصویریں متحرک رہتی ہیں۔اس کی عقل صرف اور صرف اپنی ذات کی فریفتہ ہوتی ہے،تو اس کا وجدان محض اپنی خواہشات پر چڑھاوے چڑھاتا ہے۔اس کے سینے میں ہر پیکر صدق کے لئے حسد کا غبار اٹھتا رہتا ہے۔ایسے لوگوں کے لئے حسن کو حسن سمجھنا،حسن کہنا اور حسن دیکھنا، ناممکن ہوا کرتا ہے۔یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں خبردار کرنا نہ کرنا،ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہوتا ہے(21)،لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی سنتا نہیں، مانتا نہیں اور اطاعت نہیں کرتا تو کار دعوت ہی چھوڑ دیا جائے۔ایک کوہ کن کو کیا غرض کہ پہاڑ نرم ہے یا سخت،اس کا کام بس مدام محنت اٹھانا ہے۔ایک داعی الی اللہ کی ذمہ داری بس انسانیت کی غمگساری میں اپنی دعوت کا نور بکھیرتے جانا ہے۔کیا معلوم باران رحمت کا کون سا حصہ قطرہ نیساں ثابت ہو اور کس کی آغوش کسی موتی اور گہر کی پرورش کے لئے صدف بن جائے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

و ذکر به ان تبسل نفس بما کسبت

''اور بس آپ
قرآن کے ساتھ نصیحت کرنا جاری رکھیں
کہیں ایسے نہ ہو
کہ
کوئی شخص اپنی کمائی کے ہاتھوں ہلاک ہو جائے''۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ
بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۱﴾
اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ؕ وَكُلَّ شَيْءٍ
اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ع
وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ ج
اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ
اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

آپ اسی کو ڈر سناتے ہیں جو اتباع کرتا ہے خدائی نصیحت کی اور ڈرتا ہے اس سے بغیر دیکھے پس بشارت دو ایسے شخص کو مغفرت کی اور باعزت صلے کی (۱۱)

بے شک ہم ہی زندہ کرتے ہیں مردوں کو اور لکھ لیتے ہیں وہ کچھ جو انہوں نے آگے بھیجا اور جو کچھ آثار انہوں نے پیچھے چھوڑے ہم نے گن رکھا ہے ہر چیز کو ایک روشن کتاب میں (۱۲)

بیان کیجئے ان کے لئے قصہ اس بستی والوں کا کہ جب آئے ان کے پاس رسول (۱۳)

ہوا یہ کہ جب بھیجے ہم نے ان کی طرف دو رسول تو انہوں نے دونوں کو جھٹلا دیا پھر ہم نے مدد کے لئے بھیجا تیسرا، اس طرح سب نے کہا ہم تمہاری طرف بھیجے ہوئے رسول ہیں (۱۴)

اِنَّمَا تُنۡذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّکۡرَ وَ خَشِیَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَیۡبِ ۚ فَبَشِّرۡہُ بِمَغۡفِرَۃٍ وَّ اَجۡرٍ کَرِیۡمٍ ﴿۱۱﴾

"آپ اسی کو ڈر سناتے ہیں جو اتباع کرتا ہے خدائی نصیحت کی اور ڈرتا ہے اس سے بغیر دیکھے"۔

وہ کون لوگ ہوتے ہیں کہ بلا خیز محنتیں اٹھانے کے باوجود ان کی ذات میں اعلیٰ اقدار نشو ونما نہیں پاتیں۔ وہ کورے کے کورے رہتے ہیں۔ جہالت ان کا مقدر رہتی ہے۔ متکبرین، حاسدین اور ڈھٹائی کے نشہ میں مدہوش لوگ جب احسان شناسی کے جوہر سے محروم ہو جاتے ہیں تو یہ ہوتا ہے وہ موقع جب منذرین اور مبشرین کا انذار و تنذیر اور ذکر و تذکیر ان پر اثر جمانا چھوڑ دیتا ہے۔ ایسے ماحول میں کتاب حکمت قرآن حکیم پسند نہیں کرتا کہ توحید کا درد رکھنے والا کوئی مخلص مبلغ اور ذی وقار داعی اپنے جذب وشوق، اخلاص وللّٰہیت، علم وعرفان اور مقصد وآگاہی کا گراں بہا تخم کسی بنجر زمین میں مسلسل ڈالتا رہے اور اس طرح اس کی صلاحیتیں ان لوگوں پر کھپتی رہیں جن کے ارادوں میں کجی ہو اور ان کے فہم و فراست کے ابواب مقفل ہوں وہ آنکھ کھول کر دیکھنے کو اپنی توہین تصور کرتے ہوں، کان لگا کر سننے کو قبیح سمجھنا، جن کا اعتقاد ہو اور جن کے دل کی سچائی اور حقیقت کا نور محسوس کرنے سے عاری ہو چکے ہوں۔

انذار و تنذیر کی منفعت بخشیاں، کرم گستریاں، نفع اندوزیاں اور فائدہ آفرینیاں اس شخص کا مقدر سنوار سکتی ہیں، جس میں حس حیات موجود ہو(22)۔ وہ اپنے آپ کو تبدیل کرنے پر آمادہ ہو، سمع وبصر سے کام لے، حقائق اشیاء تک رسائی حاصل کرنے کا عزم رکھتا ہو۔ خصوصاً اس میں دوصفات موجود ہوں۔ "ذکر" کی پیروی کرتا ہو اور "رحمٰن" سے بن دیکھے ڈرتا ہو۔ یہ جذبہ، آہنگ اور داعیہ اس میں اتنا پختہ اور راسخ ہو جائے کہ اس کی خلوت بھی جلوت کی طرح احتساب کے نور سے خالی نہ ہو۔ وہ ہمہ دم سوچے کہ اسے کوئی دیکھے نہ دیکھے، اس کا کوئی ساتھی ہو نہ ہو، اسے کوئی داد وتحسین دے نہ دے۔ اس نے بہر حال جادۂ حق کی طرف سفر جاری رکھنا ہے۔ یہاں یہ جان لینا بھی عبث نہیں کہ قرآن مجید نے داعین کے لئے نصاب تذکیر صرف کلام الٰہی کو قرار دیا اور حقیقت میں یہی وہ آئینہ ہمہ علم ہے جس میں عرش و فرش دیکھے جا سکتے ہیں۔

"خشی الرحمان" میں ڈر کے ساتھ رحمٰن کی ترکیب امید اور خوف کے جن ملے جلے جذبات اور احساسات کی غماز ہے(23)۔ اس کا حسن الفاظ میں سمو دینا از بس دشوار ہے۔ کسی جابر اور قاہر سے ڈرنے کے لئے کسی صلاحیت کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن کسی شفیق، رحیم اور مہربان ذات سے ڈرنے کے لئے فہیم اور ذکی ہونا بھی ضروری ہوا کرتا ہے۔ مولائے کائنات نے رسول اکرم ﷺ کی دعوت و انذار

مفردات

اِنَّمَا: حصر بمعنٰی نہیں سوائے اس کے

تُنۡذِرُ: باب افعال انذار بمعنٰی ڈرانا
ابن منظور نے لکھا کہ انذار کا مفہوم ایسا ابلاغ ہے جس میں تخویف کا پہلو غالب ہو۔ ابن عاشور نے لکھا کہ "انذار" دراصل ایسے ڈرانے کو کہتے ہیں جس سے سینوں میں خشیت پیدا ہو اور بدن اطاعت اور غلامی کے لیے تیار ہو جائیں

مَنِ: موصولہ بمعنٰی جو

اتَّبَعَ: تابعدار ہوا
کلمہ مذکورہ اتباع سے ہے اور اتباع کا لغوی معنٰی کسی کے نقوشِ پا پہ چلنا ہوتا ہے۔ (لسان العرب)

الذِّکۡرَ: مراد قرآن مجید ہے

وَ: اور

خَشِیَ: جو ڈرا
خشیت اور انذار میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر دل میں کسی کی ہیبت کے تصور سے خوف پیدا ہونا ہوتا ہے اور ثانی الذکر کسی آدمی پر کسی چیز کے بُرے اثرات واضح کر کے ہوشیار رہنے کی تلقین کرنا ہوتا ہے

الرَّحۡمٰنَ: فعلان کے وزن پر ہے اور خشی کا مفعول بہ ہے بمعنٰی بہت رحم کرنے والا

بِالۡغَیۡبِ: غیب میں

کی تاثیر کس وجد آفرین لہجے میں بیان فرمائی کہ محبوب ﷺ یہ تیرے انذار کا اثر ہوگا کہ سمجھدار لوگ خدا کے رحمٰن ہونے کے باوجود اس سے بے خوف نہیں ہوں گے بلکہ اس کی خشیت سے لرزاں وترساں رہیں گے۔

فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ

مصطفٰے کریم ﷺ نے جس دردمندی کے ساتھ اللہ کا پیغام انسانوں تک پہنچایا اسے قبول کر کے زندگی کی تجربہ گاہ میں کماحقہ، آزمانا توفیق باری کے سوا ممکن نہیں۔ تحریک اسلامی کا کارکن کتنا ہی مخلص کیوں نہ ہو اور غلامی رسول ﷺ کا جذبہ کسی شخص کے سینے میں کتنا ہی پختہ کیوں نہ ہو، سستی اور تساہل کا امکان رہتا ہے۔ نفسیاتی کمزوریوں کی یہی وہ مایوسیاں ہوتی ہیں جن کا شکار ہو کر کوئی شخص دماغی مریض ہوسکتا ہے۔ ایسے مواقع پر داعین الی اللہ کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے نصاب دعوت میں حکمت و دانش اور شفقت ومحبت اس طرح شامل کرلیں کہ ان کا مخلص سامع بے تکلف ماحول میں ان کی بات ہضم کرنے کے قابل بن جائے۔ قرآن حکیم اس معنوی حقیقت کو ''تبشیر'' سے تعبیر کرتا ہے اور اس کی یہی حوصلہ آفرینیاں بندہ خدا کو پرعزم رکھتی ہیں۔ دینی کام کرنے والوں کو اگر مغفرت کی نوید جاں فزا نہ سنائی جائے تو عین ممکن ہے کہ وہ راہ حق سے مایوس رہیں۔ کتاب حکمت سے فائدہ اٹھانے والے مخلصین کی یہی تربیتی ضرورتیں ہیں جن کی تکمیل تنذیر اور تبشیر سے کی جاتی ہے۔

اب ملاحظہ ہو۔۔۔ آیہ کریمہ کا حسن

کہ رب کائنات نے پہلے مصطفٰے کریم ﷺ کو انذار کا حکم دیا بعد میں اس کی تکمیل تبشیر سے کی اور فرمایا:

محبوب! انہیں بشارت سنادو

کہ

کارحق کرنے والو!

تم قدم بڑھاتے چلو

پرعزم رہو۔

اگر کسی موقع پر بلا ارادہ تم سے کوتاہی ہوگئی تو اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے گا، اس لئے کہ تم راہ حق کے وہ نیک دل اور معصوم مسافر ہو جنہیں اللہ کریم گام گام ''اجر کریم'' عطا فرماتا ہے(24)۔

''اجر'' کے ساتھ ''کریم'' کی قید سکون وراحت کی جو جنت بسائے ہوئے ہے اسے نذر الفاظ کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ کسی مخلص، حساس، معصوم اصلاح جو کے لئے اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ اسے معاف کردیا جائے، لیکن جب اسے پروانہ بخشش عطا کرنے کے ساتھ ساتھ باعزت صلے اور باکرامت اجر کا

مفردات

فَبَشِّرْهُ: پس اُسے خوشخبری دیجئے
''بشارت'' انذار کے برعکس اس کیفیت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جو کسی چیز یا فعل کے اچھے اثرات جان کر دل میں پیدا ہو جاتی ہے اور اس قلبی راحت کا اثر چہرے سے بھی عیاں ہونے لگ جاتا ہے

بِمَغْفِرَةٍ: لغوی معنٰی ڈھانپنا ہے اور اصطلاحاً کسی کے گناہوں کی پردہ پوشی کر لینا اور پھر انہیں معاف کر دینا مغفرت کہلاتا ہے

وَّ: اور (حرف جمع)

اَجْرٍ: صلہ، عمل کا عوضانہ
عموماً اچھے اعمال کی جزا کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن کبھی کبھار مطلق صلہ کو بھی اجر سے تعبیر کر دیتے ہیں

كَرِيْمٍ: باکرامت۔ فعیل کے وزن پر اجر کی صفت ہو کر معنٰی ایسا صلہ ہوگا جو بڑے اکرام اور عزت سے پیش کیا جائے گا

مفردات

اِنَّا نَحْنُ: جملہ مستانفہ ابتدائیہ "بے شک ہم" حرف تاکید کا استعمال ردّ انکار کے لیے ہے

نُحْيٖ: زندہ کرتے ہیں
"احیاء" شرک سے نجات دینے کے لیے استعارہ ہے، یہاں تک جملہ میں ضمیر کا اعادہ حصہ کا فائدہ دیتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ "تقویت" کے لیے ہو۔

الْمَوْتٰى: مُردوں کو
اہل شرک کے لیے استعارہ ہے

وَنَكْتُبُ: واؤ عاطفہ ہے "نکتب" فعل مضارع صیغہ جمع متکلم بمعنٰی ہم لکھتے ہیں، تفسیری معنٰی نحصی لھم اعمالھم من خیر و شر ہوگا یعنی ہم ان کے اعمال خیر اور شر سب کو گن رہے ہیں، گویا "کتابت" کنایہ ہے احصا کے لیے

مَا قَدَّمُوْا: جو انہوں نے آگے بھیجا یعنی وہ اعمال جو انہوں نے موت سے پہلے کیے

وَاٰثَارَهُمْ: اور ان کے آثار جو پیچھے پیچھے چھوڑتے رہے اثار اثر کی جمع ہے۔ ہر وہ نشان جو پیچھے رہ جائے اثر کہلاتا ہے

مژدہ بھی سنایا جائے تو اس سے بڑی بشارت اس کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے۔ "اللھم ارزقنا اجرا کریما"

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۝۱۲

"بے شک ہم ہی زندہ کرتے ہیں مردوں کو اور لکھ لیتے ہیں وہ کچھ جو انہوں نے آگے بھیجا اور جو کچھ آثار انہوں نے پیچھے چھوڑے ہم نے گن رکھا ہے ہر چیز کو ایک روشن کتاب میں"۔

اس آیۂ کریمہ کی تفسیر دو طریقوں سے کی جا سکتی ہے: ایک تو سیاق و سباق کے حوالے سے اور دوسری روایات اور آثار کی روشنی میں۔

اول الذکر صورت میں اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے معاد اور حشر کی طرف قاریٔ کتاب کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے اور ان اوہام اور خیالات کی تردید کی گئی ہے جن کے تحت مرنے کے بعد زندہ ہونے کو مستبعد خیال کیا جاتا ہے(25)۔ کتاب مجید نے نہ صرف یہ کہا کہ باری تعالیٰ مردوں کو زندہ فرمانے والے ہیں بلکہ اعمال و آثار کے محفوظ ہونے کا بھی دعویٰ فرما دیا اور تحفیظ کی تمام ممکنہ اور غیر ممکنہ صورتوں کی طرف اشارہ کیا۔ انسان جو کچھ کرتا ہے وہ پہلے مرحلے پر سوچ بن کر دماغ میں اجاگر ہوتا ہے پھر نیت بن کر دل میں عزم کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس کے اعضاء و جوارح سے افعال و اعمال کی صورت میں صادر ہوتا ہے اور پھر اچھے اور بُرے اعمال سے آثار و نتائج مرتب ہوتے ہیں جن کا دائرہ نفوذ و اثر قیامت تک کی آنے والی نسلوں تک پھیل جاتا ہے۔ قرآن مجید نے پوری وسعت نظری سے ان تمام مراحل کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ انسان کو کبھی یہ باور نہیں کرنا چاہئے کہ اس کا کوئی عمل یا سوچ باری تعالیٰ سے پوشیدہ رہ سکتی ہے۔ یہاں تو حساب اس باریک بینی سے کیا جاتا ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد بھی جو نیک اور بد عمل چھوڑے جاتے ہیں ان کے آثار پوری دقت سے محفوظ کر لئے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ نیکی کی جزا نیکی اور برائی کی سزا بدلہ دی جا سکے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس معنوی حقیقت کی طرف ایک حدیث میں اشارہ فرمایا(26):

"جس شخص نے اسلام میں کوئی نیک عمل جاری کیا تو اس کے واسطے خود اس عمل کا ثواب ہوگا اور اس کے بعد جن لوگوں نے اس پر عمل کیا ان کا بھی ثواب ہوگا بغیر اس کے کہ بعد میں عمل کرنے والوں کے ثواب میں کچھ کمی ہو اور جس شخص نے اسلام میں کوئی بُرا راستہ نکالا تو اس شخص پر خود اس بُرے عمل کا گناہ ہوگا اور اس کے بعد جو لوگ اس پر عمل کریں گے ان کا بھی گناہ ہوگا بغیر اس کے کہ بعد میں گناہ کرنے والوں کے گناہ میں کچھ کمی ہو"۔

پھر حضور ﷺ نے سورۂ یٰس کی مذکورہ آیت تلاوت فرمائی۔ (رواہ مسلم)

محدثین کرام نے اس آیہ کریمہ کے ضمن میں بہت سی ایسی احادیث نقل فرمائی جن میں کہا گیا کہ مسجدوں کی طرف بڑھنے والے قدموں کے جو نشانات زمین پر ثبت ہوتے ہیں اللہ کریم ان کا حساب بھی محفوظ فرمالیتے ہیں(27)۔

تفسیر کی دوسری جہت وہ ہے جسے ابن عاشور نے اختیار کیا۔ وہ فرماتے ہیں:

"احیائے موتی استعارہ ہے، یعنی وہ لوگ جو شرک کے مرض میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیتے ہیں، جب ان کے سرہانے کوئی صاحب اعجاز ہستی قم باذن اللہ کہہ کر انذار کا فریضہ سرانجام دیتی ہے تو عقیدہ و اعتقاد کے ان مردوں کی بوسیدہ ہڈیوں میں بھی گویا زندگی کی لہر دوڑنے لگ جاتی ہے"(28)۔

"انما تنذر" کے بعد "انا نحن نحی الموت" کو جوڑ کر پڑھنے سے جو تفسیری اور معنوی وسعت حاصل ہوتی ہے ملاحظہ ہو:

گویا رب کریم اپنے محبوب رسول ﷺ کو مخاطب کر کے ارشاد فرماتے ہیں:

محبوب رسول!
آپ تسلی رکھیں
دعوت و انذار کا نور بکھیرتے رہیں
یہ نہ سوچیں کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے
ہم قادر ہیں کہ مردوں کو بھی زندہ کر دیں
آپ کا اعجاز انذار ہوگا

اور

کفر اور شرک کی سیاہ موتوں کی وحشتیں ٹل جائیں گی
ہر سو ایمان کا سویرا ہوگا اور روشنی
یہاں تک کہ نیکی نیکی بن کر چمک اٹھے گی
اور بدی بدی ہو کر مر جائے گی

رہا یہ سوال کہ اعمال و آثار کہاں محفوظ ہوں گے قرآن مجید نے اس کی بھی وضاحت فرما دی ہے کہ "امام مبین" ہوگی۔۔۔۔ جس میں انہیں جمع کر دیا جائے گا۔

جمہور مفسرین نے امام مبین سے مراد لوح محفوظ لی ہے(29) اور بعض نے علم باری بھی مراد لیا ہے۔

مفردات

وَكُلَّ شَيْءٍ: اور ہر چیز یعنی "کل شیء من اعمال الناس" انسانی اعمال میں سے ہر چیز

اَحْصَيْنٰهُ: ہم نے گن رکھی ہے
احصا کا اساسی معنٰی گننا اور حساب رکھنا ہے۔ یہاں یہ احاطہ کرنے اور محفوظ رکھنے کے لیے بطور کنایہ استعمال ہو رہا ہے

فِيْٓ: طرف

اِمَامٍ: جو اقتداء میں آگے ہو اور اسے دیکھ کر عمل کیا جاتا ہو، یہاں اس کا اطلاق کتاب پر ہو رہا ہے، اس لیے کہ اس کی بھی اتباع کی جاتی ہے۔ اطلاق لوحِ محفوظ پر ہوگا۔ ممکن ہے "امام مبین" سے علمِ الٰہیہ کی طرف اشارہ ہو

مُّبِيْنٍ: خوب واضح اور روشن

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

''بیان کیجئے ان کے لئے قصہ اس بستی والوں کا کہ جب آئے ان کے پاس رسول ہوا یہ کہ جب بھیجے ہم نے ان کی طرف دو رسول تو انہوں نے دونوں کو جھٹلا دیا پھر ہم نے مدد کے لئے بھیجا تیسرا۔ اس طرح سب نے کہا ہم تمہاری طرف بھیجے ہوئے رسول ہیں''۔

مذکورہ صدر آیہ کریمہ کے فہم و تفہم کے لئے چند مقامات قائم کر کے تفصیل سے گفتگو کی جاتی ہے۔

مقدمہ اولیٰ:

مثال یا ضرب المثل بیان کرنے کے مقاصد کیا ہوتے ہیں؟ اور اہل زبان مثال دیتے ہوئے عموماً اس نوعیت کا مواد پیش کرتے ہیں؟ اس ضمن میں پہلے تو یہ یاد رہے کہ قرآن حکیم عام طور پر مثال، مثل اور مثل ایسے کلمات تقریباً ایک ہی معنوں میں استعمال کرتا ہے البتہ لغوی لحاظ سے کسی چیز کا کسی چیز سے مشابہہ ہونا مثل (Pattren) ہوتی ہے (30) اور مثال اس نمونہ کے لئے استعمال ہو جاتا ہے۔ جس کے مطابق کوئی چیز بنا دی جائے البتہ مثل کا معنی کسی ایک چیز کیفیت یا حال کو اس طرح بیان میں لانا ہوتا ہے کہ اس کا مقابلہ کسی دوسری چیز کیفیت یا حال سے کیا جائے (31)۔ انگریزی میں اسے (Discription) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید کی جمیع مثالیں مفاہیم قرآن اور احکام الیہہ کے وضوح اور وضاحت کے لئے ہوتی ہے اور کبھی ان کا مقصد سامع قرآن کے دل میں خشیت و عبرت، فہم و دانش، خوف و ڈر اور شوق و محبت پیدا کرنا ہوتا ہے اور بعض اوقات قرآن مجید لوگوں کے بعض افعال و اعمال کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے اور انہیں اس نوعیت کے اعمال سے باز رکھنے کے لئے ان لوگوں کے احوال سے ملتے جلتے احوال بیان کر کے مکروہ افعال سے نفرت پیدا کرنے کے لئے مثالیں دیتا ہے اور یہ بھی کہ قرآن مجید نے تذکیر و تنذیر اور فلاح و صلاح کے لئے جتنی بھی مثالیں دیں، ان میں سے بعض تو ایسی ہیں کہ ان میں بعض حالات کی بعض حالات سے کلی مطابقت پائی جاتی ہے اور بعض مواقع پر بغیر تطبیق حالی کے عبرت پذیری کے لئے نادر مثالیں دے دی جاتی ہیں۔

مقدمہ ثانی:

مثال میں جس قریہ یا بستی کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد کون سی بستی ہے؟ معاصر مفسرین کا رجحان تحقیق یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے جب بستی کا نام ظاہر نہیں فرمایا تو اس کا تعین غیر ضروری ٹھہرا (32)۔ اپنی جگہ پر رائے کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو بیک جنبش قلم اس کے مقابلے میں قدماء کی تحقیق رد کر دینا مناسب

مفردات

وَاضْرِبْ: اور بیان کیجئے
قصہ کا عطف قصہ پر ہے یا عطف تقدیراً ہے ''اضرب'' باب افعال سے امر ہے

لَهُمْ: ان کے لیے

مَّثَلًا: مثال

اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ: بستی والے اصحاب مضاف ہے اور مثل سے بدل واقع ہو رہا ہے اور عطف ہونا بھی ممکن ہے اور حال بھی واقع ہو سکتا ہے

اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ: جب آئے ان کے پاس رسول، بدل اشتمال ہے

اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ: جب بھیجے ہم نے ان کی طرف دو

فَكَذَّبُوْهُمَا: پس جھٹلا دیا ان دونوں کو انہوں نے

فَعَزَّزْنَا: پس مدد کی ہم نے

بِثَالِثٍ: تیسرے کے ساتھ

فَقَالُوْٓا: کہا انہوں نے

اِنَّآ: بتاکید ہم

اِلَيْكُمْ: تمہاری طرف

مُّرْسَلُوْنَ: بھیجے ہوئے ہیں

نہیں۔ابن کثیر کے علاوہ جمہور متقدمین کا خیال یہ ہے کہ یہاں قریہ سے مراد انطاکیہ کی بستی ہے(33) اور یہ رائے رکھنے والوں میں قتادہ، بریدہ، عکرمہ، ابن عباس، زہری، رازی، آلوسی، اندلسی، قرطبی اور ابن جریر ایسے لوگ شامل ہیں۔ ہمارے خیال میں اگر چہ یہ ضروری نہیں کہ اس بستی کا نام ضرور متعین کیا جائے تاہم ابن کثیر کے جو اعتراضات جمہور کی تحقیقات پر پیش کئے گئے ہیں ان کی اپنی تحقیق بھی اس نوعیت کی گرفت سے بچ نہیں سکتی۔

مقدمہ ثالث:

آیہ مذکورہ میں رسولوں سے مراد کون لوگ ہیں؟ اس باب میں مفسرین کی چار آراء ہیں:

پہلی رائے کے مطابق رسولوں سے مراد عیسیٰ علیہ السلام کے فرستادہ مبلغین ہیں(34)۔

دوسری رائے کے مطابق رسولوں سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام اور ان کے ایک مددگار ساتھی ہیں(35)۔

تیسری رائے کے مطابق انطاکیہ کے علاوہ کسی اور بستی کے رسول مراد ہیں جن کے نام اور کام کی تفصیلی تاریخ نامعلوم ہے(36)۔

چوتھی رائے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ان کے تابع رسول اور مرسلین مراد ہیں(37)۔

مقدمہ رابع:

آیہ کریمہ میں جن رسولوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے اسما کیا ہیں؟

پہلے دو رسولوں کے بارے میں ابن جوزی نے علماء کے تین اقوال نقل کئے ہیں(38)۔

صادق اور صدوق یہ رائے ابن عباس اور کعب کی ہے۔

یوحنا اور بولس یہ رائے وہب بن منبہ کی ہے۔

تومان اور بولس یہ رائے مقاتل کی ہے۔

اس کے علاوہ شعیب جبائی وغیرہم نے کچھ دوسرے نام بھی نقل کئے ہیں۔مثلاً ناروص اور ماروص وغیرہ۔

تیسرے رسول کے نام مختلف تفاسیر نے جو نقل کئے ہیں وہ یہ ہیں۔شمعان، شمعون، شلوم، بولص، سلوم اور حبیب(39)۔

مقدمہ خامس:

ان آیات میں سادہ سے انداز میں جو حقیقت قاریٔ کتاب کے سامنے رکھی گئی ہے، وہ فقط یہ سمجھانا کہ رسولوں کے انداز سے اکتساب فیض نہ کرنے سے نبیوں اور رسولوں کا کچھ نقصان نہیں ہوتا،

بلکہ اس کا وبال منکرین پر ہی پڑتا ہے۔ یہ حیات انسانی کا وہ وقیع تجربہ ہے جسے تاریخ کے کسی دور میں بھی دیکھا پرکھا جاسکتا ہے۔ دیکھتے نہیں اس بستی والوں کی مثال کہ رسول ان کے پاس آئے اور پھر ان کے موقف کی تائید کے لئے ایک تیسرے رسول بھیجے گئے، لیکن بستی والوں نے انکار و جحود سے کام لیا۔ ظاہر ہے اس کا نتیجہ ان کے اپنے ہی حق میں ہلاکت آفرین ثابت ہوا۔ ایک چھوٹے سے دیہہ کے اس سادہ سے واقعہ سے ہم کیا یہ اخذ نہیں کر سکتے کہ اگر ایک چھوٹی سی بستی میں بیک وقت تین رسول کام کر سکتے ہیں تو کیا موسیٰ و عیسیٰ کے بعد ایک رسول مبعوث نہیں ہو سکتے۔ یہود و نصاریٰ کی کتنی سنگدلی ہے کہ رسول کریم ﷺ کی رسالت سے انکار کر رہے ہیں۔ نہ صرف انکار بلکہ حسد اور بغض کے ایسے قبیح امراض کا شکار ہیں۔ اگر اس واقعہ میں رسولوں سے مراد عیسیٰ علیہ اسلام کے فرستادہ حواری ہی مراد لئے جائیں تو آیت کا مفہوم اور واقعہ کا عمود یہ ٹھہرتا ہے کہ پیارے حبیب ﷺ ان لوگوں کو سمجھا دیں کہ اگر کسی رسول کے سکھے ہوئے مبلغین کی تکذیب سے آبادیاں تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتی ہیں تو پھر یہ لوگ سوچتے کیوں نہیں کہ خاتم النبین ﷺ رسول جن وانس، باعث تخلیق کائنات مصطفیٰ کریم ﷺ کے انکار سے منکرین کیا ذلت و تباہی سے بچ سکتے ہیں؟

بیان واقعہ میں رسول اللہ ﷺ کے لئے تسلی کا پہلو بھی نکلتا ہے، اس طرح کہ گویا اللہ کریم رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ محبوب! اگر کسی چھوٹی سی بستی میں تین رسول بیک وقت دعوت و تبلیغ کا پرچم اٹھائے ہوئے ہوں اور ان کے انداز سے کوئی قوم جاگنے کی کوشش نہ کرے تو پھر ہم قوم ہی کو مجرم سمجھتے ہیں۔ آپ تو ایک اکیلے، ممتاز اور عظیم رسول ﷺ ہیں اور پھر سارے جہانوں کی طرف رسول ہونے کے منصب پر فائز ہیں ان بے پناہ مصروفیتوں میں اگر کوئی آپ کے انداز سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو اس کا اپنا مخ مارا ہوا ہے۔ آپ کی شان انداز میں کوئی کمی نہیں۔ اس سبق آموز قصہ نے یہ بھی بتایا کہ دنیا کی ہر چیز ختم ہو سکتی ہے۔ بہتے دریا خشک ہو سکتے ہیں، چمکتے ستارے ماند پڑ سکتے ہیں، روشن سورج گرہن کا شکار ہو سکتا ہے، خوبصورت ماہتاب بے نور پڑ سکتا ہے لیکن کسی کی تکذیب اور عداوت سے فیضان رسالت ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ مسلسل عمل ہے، رحمت بار تحریک ہے، نور پرور اعلان محبت ہے جس کے دھارے کسی کے طوفان بدتمیزی اٹھانے سے دبتے نہیں۔ زمین کی پستیاں پورا زور مارلیں۔ آسمان کی رفعت و پہنائی کو قابو میں نہیں لاسکتیں، قوموں اور ملتوں کی داعین الی اللہ پر سنگ باریاں اور خشت اندازیاں ان کے حوصلوں، ہمتوں اور ارادوں کو متزلزل نہیں کر سکتیں۔ ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ مسلسل بدتمیزیوں اور بے اعتدالیوں سے فطرت، سوئفکری اور بدعملی کا شکار انسانوں کو ذلت اور عذاب میں گرفتار کر لیتی ہے۔

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ
اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾
قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾
وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾
قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾

بولے نہیں ہو تم مگر انسان ہماری ہی طرح کے اور نہیں نازل کی رحمٰن نے کوئی بھی چیز بس تم نہیں ہو مگر
جھوٹ بول رہے ہو (۱۵)
رسولوں نے کہا رب ہمارا خوب جانتا ہے کہ ہم ضرور تمہاری طرف رسول ہو کر مبعوث ہوئے ہیں (۱۶)
اور نہیں ہم پر مگر یہ کہ پہنچا دینا واضح صاف (۱۷)
لوگ بولے ہم اچھا شگون نہیں لیتے تم سے، اگر تم نہ رُکے تو ہم تمہیں ضرور سنگسار کر دیں گے اور بے
شک ہمارے ہاتھوں تمہیں الم ناک سزا ضرور پہنچے گی (۱۸)

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ۝

''بولے نہیں ہو تم مگر انسان ہماری ہی طرح کے اور نہیں نازل کی رحمٰن نے کوئی بھی چیز بس تم نہیں ہو مگر جھوٹ بول رہے ہو''۔

علم اور جہالت کی باہمی جنگ اور مزاحمت میں انسانوں کے لئے ہمیشہ یہ مسئلہ رہا کہ وہ کس نوعیت کی قیادت پر اعتماد رکھیں اور کن اوصاف کے ساتھ متصف کسی ذات کی اطاعت اور اتباع کے لئے سرفگندہ ہوں۔ فطرت اگرچہ بلا روک ٹوک اور بغیر بحث و تمحیص کے صرف رسولوں اور نبیوں ہی کو اس قابل سمجھتی ہے کہ ان کی غیر مشروط اطاعت بجالائی جائے (40)۔ تاہم وہ غور و فکر اور تدبر و فکر کو معیوب تصور نہیں کرتی۔ رہا یہ سوال کہ انسانوں کی رہنمائی کے لئے کیا یہ طریقہ بہتر ہے کہ انہی میں سے کچھ قدسی صفات لوگوں کو منتخب کر لیا جائے یا یہ کہ کوئی فوق البشری، ماورائی اور نا قابل فہم پیچیدہ قیادت تقلید کے لئے ان کے سامنے رکھ دی جائے۔ اس موقع پر یہ سمجھنا دشوار نہیں رہتا کہ اچھا قائد وہی ہوتا ہے جو اپنے آپ کو معاشرہ کا حصہ بنا کر پیش کرے، اپنی مقدس سوچوں کو عمل کا ایسا جادہ عطا کرے کہ اس کی ذات میں نمونہ تلاش کرنے والے لوگوں کو دقت محسوس نہ ہو۔ اس کا امتیاز اگر کچھ قائم ہو تو وہ لوگوں میں رہ کر ہو، اس کا اعجاز مسیحائی اپنے حرکی دائروں سے تجاوز نہ کریں۔ انبیاء و مرسلین چونکہ انسانی رہنمائی کا فطری اہتمام ہوتے ہیں اس لئے جب وہ اپنے انقلابی کام کو آگے بڑھاتے ہیں ان کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کی دعوت طلسماتی رنگ اختیار نہ کرے، انہیں معاشرے سے الگ تصور نہ کیا جائے، لوگ ان کی ذات میں قرب کی راحت محسوس کریں، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی رسالت اور نبوت کی عظمتوں کا ذکر بھی "بشر مثلکم" (41) کے تناظر ہی میں کرتے ہیں یہ اس لئے نہیں ہوتا کہ "معاذ اللہ" وہ روحانی، فکری، ظاہری اور باطنی لحاظ سے عام انسانوں کی طرح ہوتے ہیں بلکہ ان کے تقدس کا لباس بشریت میں ہونا اطاعت اور اتباع کو آسان بنانے کے لئے ہوتا ہے، ان کی ذات میں فوق البشری، ملکوتی اور لاہوتی اوصاف ہونے کے باوجود وہ انسانوں سے اس سے زیادہ مطالبہ نہیں کرتے کہ انہیں ہدایت کا مینار نور، رسول تسلیم کر لیا جائے۔ ان کی غیر مشروط اطاعت اختیار کر لی جائے۔ اپنے مقام عالی اور لوگوں کی ضرورت فطری دونوں کی رعایت رکھتے ہوئے وہ اپنے سارے دعوے "بشر مثلکم" کے ماحول ہی میں کرتے ہیں اور رسولوں کو یہی وہ عظمت فکر ہے جو جاہل انسانوں کی سمجھ میں نہیں آتی، بہتیرے ان کی رسالت کو اس لئے تسلیم نہیں کرتے کہ وہ لباس بشریت میں ہوتے ہیں (42) اور بہتیروں کی تہذیب نفس اس لئے نہیں ہو

مفردات

قَالُوْا: کہا انہوں نے
فعل ماضی معروف صیغہ جمع مذکر غائب

مَآ: نہیں (نافیہ)

اَنْتُمْ: تم

اِلَّا: استثنیٰ معنیٰ مگر

بَشَرٌ: بشرۃ سے ماخوذ ہے اور اس کا معنیٰ انسانی جلد کی ظاہری سطح ہوتی ہے اگرچہ بشر کا معنی انسان ہوتا ہے، لیکن یہ لفظ محض طبعی ساخت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ خصوصیات اور صفات کا امتیاز اس لفظ سے اخذ نہیں کیا جا سکتا دیکھئے بشر کا اطلاق بچے، جوان اور بوڑھے بلکہ عورت اور مرد سب پر ہوگا لیکن خصوصیات کے اعتبار سے ان سب میں زمین آسمان کا فرق ہوگا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، لسان العرب، ابن منظور اور تاج العروس، زبیدی حنفی کی)

"بشر" جماع کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، اس لیے کہ جماع میں بھی عورت اور مرد کی ظاہری جلدیں آپس میں ملتی ہیں، اسی طرح "بشارت" کا لفظ ایسی خبر کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں چہرہ متغیر ہو جائے، چونکہ یہ تغیر بھی ظاہر جلد پر رونما ہوتا ہے، اس لیے اسے "بشارت" سے تعبیر کر دیتے ہیں

پاتی کہ وہ عظیم رسولوں کو بھی اپنے ہی مقام پر دیکھتے ہیں(43)۔جس طرح ان کی ذات میں جھانکنے سے سوائے تاریکی اور اندھیرے کے کچھ نہیں ملتا، وہ سمجھتے ہیں کہ شاید رسولوں اور نبیوں کا معاملہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔فکر وشعور سے تہی دست ان بدقسمت انسانوں کا معاملہ بڑا ہی عجب واقع ہوا ہے کہ ان کے ہاں جب حواس وفہم، جمود اور زہول کا شکار ہو جاتے ہیں تو یہ پھر سنگ وحجر کی سلوں کے سامنے بھی جھک لیتے ہیں، درختوں اور چشموں کو بھی اپنا مسجود بنا لیتے ہیں، ستاروں اور سیاروں کو بھی اپنا نافع وضار تسلیم کر لیتے ہیں۔نہیں مانتے تو بس زندہ رسولوں کو نہیں مانتے، شاید اس کی وجہ یہ ہوتی ہوگی کہ پتھروں کے مردہ صنم انسانوں کے اختیار اور مفادات کو نہیں چھیڑتے لیکن رسولوں کی زندہ قیادتیں اطاعت کا مطالبہ کرتی ہیں (44)اور ضدی اور ہٹ دھرم انسانوں کے لئے اپنی سرکشی سے باز آنا ان کی زندگی کا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے ان موقعوں پر فکر وشعور کی یہ کافرانہ سوچیں رکھنے والے انسان نفسیاتی سہارے تلاش کرتے ہیں۔حقیقت کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ

منکرین حق کا رسالت کے نور سے تاباں اور روشن ماحول کو دیکھ لینے کے باوجود یہ کہنا کہ ''رحمٰن نے کچھ بھی نازل نہ کیا'' سوائے اپنے نفس کو طفل تسلی دینے کے اور کچھ نہیں۔اپنی ذات کو دھوکہ دینے کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان روشنی دیکھ لے لیکن تاریکی سے چمٹا رہے اور اس کے سینہ سے اٹھنے والی تمنائیں اور آرزوئیں بھی اندھیروں ہی میں بھٹکتی رہیں اور بدفکری کے نشہ میں مدہوش انسان خدا کو رحمٰن بھی کہے اور پھر یہ ہنگامہ بھی اٹھائے کہ رحمٰن نے کچھ نازل نہیں کیا۔فکر کی یہ پسماندگی دیکھئے کہ انسان کسی کو سخی بھی کہے اور پھر اس کے بارے میں یہ شور بھی اٹھائے کہ سخی کچھ دیتا نہیں۔خدائے رحمٰن تو وہی ہو سکتا ہے جو اپنی رحمت گستریوں سے ظاہری اور باطنی ہر قسم کے رزق سے انسانوں کو بہرہ مند کرے(45)۔

مت اور مخ سے محروم انسانو!
اگر تم نے مان لیا
کہ خدائے مصطفیٰ ﷺ
رحمٰن ہے یعنی رحمتوں والا ہے
تو
پھر یہ بھی جان لو
کہ

مفردات

مِّثْلُنَا: ہماری مثل، ہمارے جیسے
صاحب المنجد نے شبیہ اور نظیر اس کا معنی ''نقل'' کیا ہے۔مثل کی جمع امثال آتی ہے

وَمَآ: اور نہیں

اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ: نازل کیا رحمٰن نے

اَنْزَلَ: باب افعال ہے اور ترکیب میں لفظ رحمٰن اس کا فاعل واقع ہو رہا ہے

مِنْ شَيْءٍ: کوئی چیز
من حرف جار ہے اور شیء مجرور ہے

اِنْ اَنْتُمْ: نہیں تم

اِلَّا: مگر

تَكْذِبُوْنَ: جھوٹ کہتے ہو
اس کا مادہ کذب ہے

مفردات

قَالُوۡا: بولے وہ
رَبُّنَا: پروردگار ہمارا
یَعۡلَمُ: جانتا ہے
اِنَّاۤ: بے شک ہم
اِلَیۡکُمۡ: تمہاری طرف
لَمُرۡسَلُوۡنَ: بھیجے گئے ہیں

حضور ﷺ کی رسالت اس کی رحمت کی سب سے بڑی دلیل ہے
گویا
رحمٰن تو وہی ہو سکتا ہے جو کچھ نازل کرے
اب مصطفیٰ کریم ﷺ کے بارے میں یا دیگر رسولوں کے بارے میں یہ کہنا کتنا تعجب ناک ہوگا
کہ رحمٰن نے کچھ نازل نہیں کیا

قَالُوۡا رَبُّنَا یَعۡلَمُ اِنَّاۤ اِلَیۡکُمۡ لَمُرۡسَلُوۡنَ ﴿۱۶﴾

''رسولوں نے کہا رب ہمارا خوب جانتا ہے کہ ہم ضرور تمہارے طرف رسول ہو کر مبعوث ہوئے ہیں''۔

قرآن مجید کی یہ مختصر سی آیۂ کریمہ جو مجاز لفظی اور بلاغت معنوی کے حسن سے لبریز ہے۔ قاریٔ کتاب کے سامنے غور و فکر کے لئے چار چیزیں رکھتی ہے:

پہلی تو یہ کہ دعوت حق دینے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا ''تشخص'' اور ''حقیقت حال'' پوری دلجمعی اور اطمینان کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ وہ جو کچھ ہے وہی کچھ ہو کر دعوت کا پرچم اٹھائے۔ اگر وہ اپنی ذات کے اوپر پردہ ڈالے گا تو تحریک دعوت کے کسی موڑ پر اس کے لئے مشکلات پیدا ہو جائیں گی اور اگر وہ اپنی ذات میں محاسن اور اوصاف بڑھا چڑھا کر بیان کرے گا تو ہیجان انگیزی اور مبالغہ آرائی کا منفی اثر اس کی اپنی ہی ذات پر پڑے گا۔ جس کا حتمی نتیجہ تحریکی خسارہ پر ہو گا، یہی وہ حکمت ہوتی ہے جس کی وجہ سے انبیاء اور رسول صاف صاف کہہ دیتے ہیں '' کہ ہم رسول ہیں'' ہماری کوئی بات ہماری طرف سے نہیں، ہمارا سب کچھ ہمارے رب کا عطا کردہ ہے، ہم آئے نہیں ہم بھیجے گئے ہیں(46)۔

دوسری چیز رسولوں کا ''انا الیکم لمرسلون'' (ہم تمھاری طرف بھیجے گئے) کہنا ہے۔ یہاں دعوتی نقطہ نظر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بھرپور تحریکیں جب بھی اٹھتی ہیں تو ان کے بغیض حاسدین ان کا تاثر زائل کرنے کے لئے ان کے فکری اہداف بدلنے کی سعی کرتے ہیں تا کہ اصل مقصد سے توجہ ہٹ جائے، لیکن باحکمت دعوت دینے والے اپنے مقاصد سے دور نہیں ہٹتے بلکہ اپنی پوری توجہ اپنے تحریکی ہدف پر پھینک دیتے ہیں۔ انبیاء اور مرسلین سے بڑا داعی کون ہوگا۔ ایسے موقعوں پر متذکرہ حکمت ہی کی بنا پر وہ '' انا الیکم '' ''بس ہم تو تمھاری ہی طرف اصلاح کے لئے مامور ہیں'' کہہ کر بافراست مصلح ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ پہاڑ اپنی جگہ سے سرک سکتے ہیں لیکن نبی اور رسول کو اپنے ہدف سے پیچھے نہیں ہٹایا جا سکتا۔

تیسری چیز اپنے جمیع معاملات میں اپنے رب پر نظر رکھنا ہوتا ہے۔اس کی رضا کو اپنی مرضیوں پر غالب کرنا ہوتا ہے۔ مایوسیوں کے موقع پر اس سے حوصلوں کا نور لینے کے لئے اس کے سامنے ہاتھ پھیلانے پڑتے ہیں۔اس کی ذات کے ساتھ شیفتگی اور جنون کی حد تک تعلق رکھنا پڑتا ہے۔یہی وہ رسم عشق ہے جس کی غلامی کرنے والوں کے جذبوں کی خوشبو سونگھ کر لوگ تحریک حق سے وابستہ ہوتے ہیں۔

چوتھی چیز یہ کہ قیادت کی صلاحیتیں خداداد ہوتی ہیں وہ خود پیدا نہیں کی جاسکتیں۔خصوصاً رسالت، تو وہ خواہش اور آرزو سے حاصل نہیں کی جاسکتی(47)۔ یہ وہ رحمت ہے اللہ جسے چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں۔رسول کی بجائے مرسل کہنا یہی حکمت رکھتا ہے۔

اب غور کیجئے! اس آیۂ کریمہ میں کہ بستی والوں کے سامنے رسولوں نے جب دعوت حق رکھی تو انھوں نے اس دعوت کو رد کر دیا۔اب بجائے اس کے کہ رسولوں کے سینوں میں مایوسی پیدا ہوتی وہ پوری دل سوزی کے ساتھ قوم کو سمجھانے لگے:

''تمھارا رب خوب جانتا ہے

کہ ہم تمھاری ہی طرف رسالت کا نور لے کر مبعوث ہوئے''۔

وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ⑰

''اور نہیں ہم پر مگر یہ کہ پہنچا دینا واضح صاف''۔

''نہیں ہے ہم پر مگر (حق) کھول کر بیان کرنا''۔ یہ فقرہ دو مفہوم رکھتا ہے ایک تو یہ کہ اس میں داعی الی اللہ کے لئے تسلی کا پہلو ہے کہ جب وہ کار دعوت کے لئے صعوبتیں اٹھاتا ہے تو اس دوران ذمہ داریوں کے بارگراں سے احساسات بوجھل ہو جاتے ہیں اور لوگوں کی ہٹ دھرمی اور انکار کی روش اس کے اعصاب کو تھکا دینے والے حالات پیدا کر دیتی ہے۔اس مقام پر وہ اپنے مخاطبین کے ضمیر پر ایک حکیمانہ دستک دیتا ہے۔وہ یہ کہ اگر تم نہیں مانتے تو اس میں میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں، میں نے ہر چند کوشش کی کہ تم راہ حق پر قائم رہو لیکن تم خود ہی تاریکیوں پر اڑنے والے بن گئے اور نور حق سے دست کش ہو جانے کو پسند رکھتے رہے۔میری طرف سے پیغام حق پہنچانا ہی میرا فرض منصبی ہے۔میں اس کا مکلف نہیں کہ تمھیں پکڑ پکڑ کر راستی کی راہوں پر چلاؤں(48)۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اس نکہت پرور جملہ میں لفظ ''البلغ'' دعوت الی اللہ کی تمام حکمتوں، موعظت حسنہ کے تمام پہلوؤں، امر بالمعروف کی تمام راہوں، نہی عن المنکر کے تمام راستوں، بیان حق کی کل سحر انگیزیوں، وضوع صدق کی سب کاوشوں اور صدائے انقلاب کی جمیع نتیجہ خیزیوں کے لئے ایک

مفردات

وَمَا: اور نہیں
عَلَيْنَآ: ہم پر
اِلَّا: مگر
الْبَلٰغُ: ابلغ سے اسم مصدر ہے
الْمُبِيْنُ: بمعنٰی خبر کا پہنچا دینا

ابن عاشور نے کہا کہ ذوات کے پہنچانے کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا

جامع اور مانع اصطلاح ہے (49) گویا داعی الی اللہ ایسے نہیں ہوتا کہ ایک خطیب کی طرح الفاظ اور کلمات سے کچھ دیر کھیلے اور پھر آخر میں کہہ دے "وما علینا الا البلغ"، مخلص داعین کے نزدیک لفظ بازی کی کچھ حیثیت نہیں ہوتی وہ "البلغ" اور تبلیغ کا مفہوم یہ سمجھتے ہیں کہ سب سے پہلے یہ طے کرلیا جائے کہ دعوت کا مواد کیا ہے پھر اس کے بعد اس مواد دعوت کو اپنے مخاطب کی روح کی گہرائی میں اتار دینا ان کا ہدف ہوتا ہے اس کے لئے وہ اس بات کا بھی جائزہ لیتے رہتے ہیں کہ ان کی طرف سے مخاطب دعوت کے سامنے کوئی ایسا مطالبہ نہ ہو جس میں حرص، اتباع ہواء، پیروی نفس اور حصول شہرت ایسے سفلی جذبے اور افعال شامل ہوں۔ داعی الی اللہ حتی المقدور ان باتوں سے گریزاں رہتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اپنی سوچوں اور افکار، جذبوں اور احساسات کی ترجمانی کے لئے مناسب الفاظ، موزوں ترکیبیں اور دل نشیں لہجے اختیار کر لیتا ہے، لیکن اس کے ہاں لفظوں کے صرف لبادے نہیں ہوتے بلکہ ان کے اندر زندہ مفہومات کے انقلابی پیکر موجود ہوتے ہیں، وہ اپنی بصیرت کے زور سے لفظ اور معنی، نظریہ اور عمل کے راستے جدا جدا نہیں ہونے دیتا۔ اس کی ہر بات نتیجہ خیزی کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔ وہ اپنی اصلاح کی تحریک میں کوئی ایسا انداز اختیار نہیں کرتا جس میں پیچیدگیاں ہوں۔ اس طرح کہ اس کی دعوت سادگی اور فطری حسن سے محروم ہو جائے۔

"وما علینا الا البلغ" کا حسن اب اس طرح ملاحظہ ہو کہ اللہ کے رسول یہ جملہ کہنے سے پہلے کن کن چیزوں کا اہتمام کرتے ہیں:

- اوّلاً ان کی زندگی بے مقصد نہیں ہوتی۔
- ثانیاً ان کی دعوت میں اخلاص للّٰہیت اور دردمندی کا نور نمایاں ہوتا ہے۔
- ثالثاً ان کی دعوت سادگی اور فطری حسن کی حامل ہوتی ہے۔
- رابعاً ان کی دعوتی مقالات میں صدق کا نور موجود ہوتا ہے۔ ان کے ہاں قول اور فعل میں تضاد نہیں ہوتا۔
- خامساً وہ اصلاح جوئی کی کوششوں پر کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے بلکہ ان کے تمام کام بے لوث فرماتے ہیں۔
- سادساً وہ اپنی باتوں کی تائید میں انفس و آفاق سے ہر قسم کے دلائل اور براہین پیش کرتے ہیں۔
- سابعاً ان کے دعوت کے نتیجے میں ہر شخص خیر اور شر کے نتائج سے آگاہ ہو جاتا ہے۔
- ثامناً ان کی تمام کوششیں اقتدار نفس کی خاطر نہیں ہوتیں بلکہ اللہ کے لئے ہوتی ہے۔
- تاسعاً وہ اپنی دعوت کے نتیجے میں ماحول کو اصابت اور راستی کے نور سے بھر دیتے ہیں، اس طرح کہ ہر شخص محسوس کرنے لگتا ہے کہ ان کے دامن سے وابستگی میں سعادت ہے۔ ان سے ترک تعلق کا

نتیجہ تباہی ہے۔

عاشراً ان کا سارا کام پوری منصوبہ بندی کے ساتھ مرحلہ در مرحلہ علیٰ وجہ البصیرت ہوتا ہے۔

وہ دعوت الی اللہ کی ان تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد فرماتے ہیں "وما علینا الاالبلغ" کے ساتھ "المبین" کی قید صاف صاف اور واضح ہونے کا مفہوم پیدا کرتی ہے(50)۔ رازی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مبین دعوات انبیاء کی وہ صفت ہے جس میں حق اور باطل جدا جدا ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی موقع پر کسی بھی حیثیت میں اکھٹے نہیں ہوتے(51)۔

قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ⑱

"لوگ بولے ہم اچھا شگون نہیں لیتے تم سے، اگر تم نہ رکے تو ہم تمہیں ضرور سنگسار کر دیں گے اور بے شک ہمارے ہاتھوں تمہیں الم ناک سزا ضرور پہنچے گی"۔

بستی میں جب رسولوں نے دعوت کا کام شدت اور زور سے شروع کیا تو اولاً مزاحمت صرف انکار کے نفسیاتی حیلوں تک محدود رہی، اس کے بعد جملے چست کرنے اور تضحیک کا مرحلہ آیا اور پھر عملی رکاوٹیں کھڑی کی جانے لگیں اور جہالت فعال ہو کر اپنا رنگ جمانے لگی۔ یہ مکروہ شے صرف موجود ہی ہو تو قومیں تباہ ہو جاتی ہیں چہ جائیکہ فعال ہو کر حق کے خلاف متحرک ہو جائے۔ رسولوں کی تحریک دعوت میں یہ لرزا دینے والا موڑ تھا۔ وہ محبتوں اور ہمدردیوں کے آب صافی سے لوگوں کے دل دھو دینا چاہتے تھے لیکن لوگ اپنی قدیم جہالتوں اور روایتی گمراہیوں سے چمٹے رہنے ہی میں سکون محسوس کرتے تھے۔ ماحول میں کتنی بار ایسے ہوتا کہ حسن فطرت کی گل اندازیاں ان کی آنکھوں میں راحت کا نور ٹپکاتیں لیکن وہ جہالت کے سیل رواں میں تنکے کی طرح بہتے جاتے اور فطرت کی کرم فرمائیوں اور رحمت افروزیوں کی پروا تک نہ کرتے اور ان کی غافل اور اندھی آنکھوں میں خدائی نعمتوں کے سلسلے میں قدر دانی کے جذبے اور رویے پیدا نہ ہوتے، اس کے برعکس اگر ایک پتا بھی زور سے ہلتا اور اس کا ارتعاش انہیں ناگوار گزرتا تو وہ اسے رسولوں کی دعوت کے ساتھ جوڑ دیتے کہ ہو نہ ہو یہ انہی کی بدفالی کا نتیجہ ہو۔ بارش رکتی اور دھوپ تیز ہو جاتی تو بھی وہ اس سے یہی نتیجہ اخذ کرتے کہ یہ رسول جب سے ہمارے دیوتاؤں کے خلاف ہوئے ہیں اور عجب نوعیت کی توحید بیان کرنی شروع کی ہے اس وقت سے ہمیں چین نصیب نہیں ہوا۔ اگر انہیں بستی سے نکال دیا جائے تو شاید امن وسکون کی ہوائیں چلنے لگیں۔ مفسرین نے لکھا کہ یہ انہی لوگوں کی بد اندیشیاں تھیں کہ وہ پوری طاقت اور قوت کے ساتھ رسولوں کے خلاف منظم مزاحمت کرنے لگے(52)۔

مفردات

قَالُوْٓا: کہا انہوں نے

اِنَّا: بے شک ہم

تَطَيَّرْنَا: باعث نحوست سمجھتے ہیں اس لفظ کی اصل یہ ہے کہ امور مختلفہ میں خیر اور شر کی پہچان حاصل کرنے کے لیے پرندوں سے دلیل پکڑنا، ان کے آنے جانے سے یا ان کے سروں پر بیٹھنے سے کسی کام کے اچھا یا برا ہونے کا عقیدہ بنالینا۔ محاورۃً ہر قسم کی بدفالی اور بدشگونی کے لیے یہ لفظ مستعمل ہے

بِكُمْ: تم سے مفسرین نے لکھا کہ یہاں "بکم" سے مراد "بدعوتکم" ہے یعنی تمہاری دعوت سے ہم برا شگون لیتے ہیں

لَىِٕنْ: اگر

لَّمْ: نہ

تَنْتَهُوْا: باز آئے

لَنَرْجُمَنَّكُمْ: تو ہم تمہیں سنگسار کریں گے قتادہ نے رجم پر دو احتمال نقل کیے ہیں: ایک تو یہ کہ رجم سے مراد قتل ہے اور دوسرا ایذا دینا ہے۔ مجاہد کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ رجم سے مراد برا بھلا کہنا اور طعن وتشنیع ہو

وَ: اور

لَيَمَسَّنَّكُمْ: ضرور پہنچے گا تم کو

مِّنَّا: ہم سے

عَذَابٌ: سزا لغۃً عذب روکنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ سزا بھی جرائم سے روکنے کا ذریعہ ہوتی ہے اس لیے اسے عذاب کہہ دیتے ہیں

اَلِيْمٌ: دردناک

مزاحمت کا پہلا مرحلہ یاوہ گوئی تھی اور وہ قدم قدم پر اس غلیظ پروپیگنڈہ کی نجاست پھیلا رہے تھے کہ وہ لوگ جنھیں معاشرہ پاکیزہ سمجھتا ہے معاذ اللہ وہ طہارت نفسی سے بہت دور ہیں بلکہ ان کی بدفالی سے ہمارے لئے جینا دوبھر ہوگیا ہے۔۔۔!!

دوسرا مرحلہ منظم نفسیاتی مزاحمت کا تھا، یعنی رسول اگر باز نہیں آئیں گے تو ہم ان پر تہمتوں، الزامات، گالی گلوچ اور بے جا اور ناروا طعنوں کی سنگ باریاں کریں گے اور اس طرح ان کے لئے زندگی کی بساط تنگ ہوجائے گی(53)۔۔۔!!

تیسرا مرحلہ عملی مزاحمت کا تھا کہ ہم انہیں شہر سے عملاً باہر نکال دیں گے اگر اس میں ہمیں کامیابی نہ ہوئی تو سنگ زنی سے ان کی بوٹی الگ الگ کردی جائے گی اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہمیں انھیں جلا بھی دینا پڑا تو ہم اس سے دریغ نہ کریں گے (54)۔۔!!

یہ سب کچھ کیوں ہوگا؟ صرف اس لئے کہ رسول پاکیزہ رہنا چھوڑ دیں، وہ بدکاریوں سے منع نہ کریں، وہ کوئی ایسا نظام نہ دیں جس سے لوگوں کے مفادات کی بھٹیاں ٹھنڈی پڑ جائیں۔ وہ کسی ایسے عمل سے ان کا تعارف نہ کروائیں جس سے ان کے دیوتاؤں کی عزت کا مندا ہو۔ وہ قیادت کا کوئی ایسا تصور پیش نہ کریں جس سے لوگوں کے توہمات اور طلسمات کے بنے ہوئے محلات دھڑام سے گر جائیں۔ وہ اپنے مخصوص لہجوں میں کہیں ایسا کلام پیش نہ کریں جس سے ان کے منتر جنتر نابود ہوجائیں۔ یا تو یہ ان کے ساتھ مل کر رہیں یا پھر وہ انہیں الم ناک سزا دیں گے۔

قرآن مجید نے بستی والوں کے تناظر میں حق پر پیش آنے والے ان حالات کی کہانی بطور داستان نہیں بیان کی بلکہ یہ ایک استعارہ ہے ان حالات کے لئے جو ام القریٰ ''مکہ'' شریف میں حضور انور ﷺ کو پیش آرہے تھے۔۔۔!!

رسالت مآب ﷺ بطحا کی وادی میں پیغام خدا کا نور بکھیر رہے تھے اور ان کے مخاطبین گالی گلوچ کے طوفان، دھمکیوں کے وحشیانہ انداز، طعن و تشنیع کے دکھ دہ حملے، بے رخیوں کے نازیبا حملے، ہٹ دھرمیوں کے ناگوار و تیرے، سنگ دلیوں کے کافرانہ مظاہرے، سازش آفرینیوں کے منافقانہ منصوبے اور جہالتوں کے الم ناک نمونے پیش کر رہے تھے

اور رسول کریم ﷺ اپنے

انداز محبت سے

جوش دعوت سے

حسن رحمت سے

حلق کرامت سے

اور خوئے سخاوت سے ان کی تقدیر بدلنے کے سامان فراہم فرما رہے تھے۔ مصطفیٰ کریم ﷺ کی شفقتوں اور رحمتوں کے مقابلہ میں منکرین رسالت کی کافرانہ روش کو اب ذرا قرآن حکیم کی زبان میں ملاحظہ فرمائیں:

لوگ بولے ہم اچھا شگون نہیں لیتے تم سے، اگر تم رکے نہ تو ہم تمہیں ضرور سنگسار دیں گے اور بے شک تمہیں ہمارے ہاتھوں الم ناک سزا پہنچے گی۔

مصطفیٰ کریم ﷺ کی راہوں پر پلکیں بچھانے والے نیک دل حمیدہ خصلت

اور جان نثار غلامو!

تم بھی اگر چاہو کہ بستی بستی، نگر نگر، شہر شہر اور قریہ قریہ

سو بہ سو اور کو بکو

محبتوں کی شمعیں روشن کرو

تو یاد رکھنا تمہیں بھی ان حالات کا سامنا کرنا ہوگا

اگر زندگی پیاری ہو تو

تمہیں یہیں سے واپس لوٹنا ہوگا۔

تمہیں ان لوگوں کو بھی سینے سے لگانا ہوگا جو لوگ تمہیں بدشگون سمجھیں گے

اور تمہاری ہر نیکی کو بدی تصور کریں گے۔

✿✿✿✿✿

قَالُوْا طَآىِٕرُكُمْ مَّعَكُمْ ؕ اَىِٕنْ ذُكِّرْتُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ
مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾
وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا
الْمُرْسَلِيْنَ ۙ﴿۲۰﴾
اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾

رسولوں نے فرمایا تمہاری بدشگونی تو تمہارے ساتھ ہے، کیا (تمہاری یہ باتیں) اس لئے (ہیں) کہ
تمہیں نصیحت کی گئی؟ بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ تم لوگ حدیں توڑنے والے ہو (۱۹)
اور (اتنے میں) آیا شہر کے پرلے سرے سے دوڑتا ہوا ایک شخص اور بولا اے میری قوم! پیروی
اختیار کرو رسولوں کی (۲۰)
پیروی اختیار کرو اس ذات کی جو تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتی اور وہ سیدھی راہ پر بھی ہیں (۲۱)

قَالُوْا طَآىِٕرُكُمْ مَّعَكُمْ ؕ اَىِٕنْ ذُكِّرْتُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

''رسولوں نے فرمایا تمہاری بدشگونی تو تمہارے ساتھ ہے، کیا تمہاری یہ باتیں اس لئے ہیں کہ تمہیں نصیحت کی گئی؟ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ تم لوگ حدیں توڑنے والے ہو''۔

''قالو طائر کم معکم'' رسولوں نے کہا: ''تمہاری بدشگونی تمہارے ساتھ ہیں''۔ یہ گالی کا جواب گالی سے نہیں بلکہ جھوٹ کا جواب سچ سے ہے، اندھیروں کا جواب روشنیوں سے ہے، پستیوں کا جواب بلندیوں سے ہے، زحمتوں کا جواب رحمتوں سے ہے، نقل کا جواب اصل سے ہے، اور سطحیت کا جواب معنویت اور حقیقت سے ہے۔۔۔۔!!

جہلا نے کہا تھا ''ہم تمہیں معاذ اللہ باعث نحوست سمجھتے ہیں'' اور رسولوں نے اس کے بارے میں جواب میں ارشاد فرمایا ہے ''ہم نحوست کو تمہارے ساتھ سمجھتے ہیں'' ان دونوں جملوں میں کیا فرق ہے؟ تدبر سے معلوم ہوتا ہے کہ جہلا کا جملہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ نحوست اشیاء میں ہوتی ہے اور مختلف لوگ باعث نحوست ہوتے ہیں لیکن رسولوں کا جواب ایک طرف تو دعوت کی حکمتیں بکھیرتا ہے اور دوسری طرف ان کی مبارک زبان سے نکلنے والا یہ مختصر سا فقرہ اس عظیم ''اعتقاد'' کا درس بھی دیتا ہے کہ نحوست اور سعادت اشیاء میں یا حالات میں نہیں ہوتی بلکہ عقائد اور افعال میں ہوتی ہے۔ یہ نیتیں اور اعمال ہوتے ہیں جو باعث سعادت یا موجب شقاوت ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے ''طائر کم معکم'' کا معنی یہ ہوگا کہ جن خساروں اور نقصانات، امکانات اور اندیشوں کو تم ہماری جانب منسوب کرتے ہو درحقیقت ان کے عقب پر تمہاری فاسد نیتیں اور تمہارے فاجرانہ اعمال سوار ہیں اگر تم جہالت کا حصار توڑ دو اور فہم و فراست کی فضا میں سانس لینا گوارا کرلو تو تمہاری خوش اعمالیاں حالات کو تبدیل کرسکتی ہیں، لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہاری فاسد سوچوں اور اور پست حیلوں کا زہر تمہیں ہلاک کردے گا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ شخص بھی بدقسمت ہوتا ہے جو بدی اور برائی کا ارتکاب کرتا ہے لیکن اس شخص کی شقاوتیں اس شخص کی بدقسمتیوں کا عشر عشیر بھی نہیں ہوتیں جو بدی کو نیکی تصور کرتا ہے۔ باقی رہ گیا معاملہ اس شخص کا جو نیکی کو بدی سمجھ کر اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرتا ہے اس جیسا زیاں کار دنیا میں کوئی بھی نہیں ہوسکتا ''طائر کم معکم'' میں ان تمام حقیقتوں کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں۔

''اَىِٕنْ ذُكِّرْتُمْ'' یہ استفہام انکاری ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے یہ مثال ذہن میں لائیے کہ ایک طبیب ہو جو کمال ہمدردی سے ایک مریض کو دوا دے اور مریض کے جسم کے فاسد مادے ختم کرنے کی کوشش کرے اور دوسری طرف مریض اس کے طریق علاج کو سمجھ کر یا نہ سمجھتے ہوئے اسے دھمکیاں دے کہ مجھے ذرا ٹھیک ہو لینے دو پھر میں تمہیں سمجھ لوں گا، اس موقع پر طبیب اس سے یہی کہے گا کہ تم مجھے اس لئے مارو گے کہ میں

مفردات

قَالُوْا: بولے وہ

طَآىِٕرُكُمْ: تمہاری بدشگونی

مَّعَكُمْ: تمہارے ساتھ، یعنی ''فی نفوسکم'' تمہارے اپنے ہی نفوس میں ہے

اَىِٕنْ: کیا اگر یہاں استفہام انکاری اور حرف شرط کو جمع کردیا گیا ہے۔ اصل عبارت یوں تھی:

اتشأمون بالتزکیران ذکر تم

ذُكِّرْتُمْ: تم سمجھائے جاؤ

بَلْ: بلکہ

اَنْتُمْ: تم

قَوْمٌ: قوم

مُّسْرِفُوْنَ: اسراف سے اسم فاعل ہے حدود سے تجاوز کر جانا

مفردات

نے تمھیں ہمدردی سے نوازا، تمھارا علاج کیا، تمھیں روبصحت ہونے میں ممکن مدد سے نوازا۔ قرآن مجید نے دعوت حق دینے والوں سے بدسلوکی کرنے والوں کو نہایت بصیرت افروز لہجے میں سمجھایا کہ "اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ" معنی یہ ہوا کہ لوگ رسولوں کا انکار کرتے ہیں، الزامات لگاتے ہیں، جان سے مار دینے کی دھمکیاں دیتے ہیں اور رسول بڑی محبت سے سمجھاتے ہیں کہ تم یہ دھمکیاں اس لیے دیتے ہو کہ تمھیں نصیحت کی گئی، تمھیں تمھارے اعمال کے وبال سے آگاہ کیا گیا اور تمھیں اعتقادی اور عملی اعتبار سے روبصحت کرنے کی سعی کی گئی۔۔۔!!

بل انتم قوم مسرفون "بلکہ تم لوگ حدیں توڑنے والے ہو" رسولوں کی دعوت کے مقابلہ میں ان کا وہ کون سا رویہ تھا جسے قرآن حکیم نے حدیں توڑنے سے تعبیر کیا۔ ہمارے خیال میں تفاسیر کی مدد سے انھیں یوں قلمبند کیا جاسکتا ہے۔۔!!

انہوں نے غور وفکر کی روش ترک کردی تھی۔۔۔!!

ان میں حق قبول کرنے کا نور ماند پڑ چکا تھا۔۔۔!!

وہ شرک کا ارتکاب کرتے تھے۔۔۔!!

وہ خیر وشر میں تمیز کرنے کے جذبوں سے عاری ہو چکے تھے۔۔۔!!

ان کے نزدیک اکرام وتکریم کا پیمانہ بھونڈی تہذیبی اقدار تھیں وہ زندہ کردار اور تاباں سیرت کو باعث عزت تصور نہیں کرتے تھے۔۔۔!!

وہ زندہ نظریات اور قابل عمل منصوبے اختیار کرنے کی بجائے توہمات اور بدی کی حد تک فال گیریوں میں مبتلا تھے۔۔۔!!

حالات کا صحیح جائزہ لینے سے وہ عاری ہو چکے تھے۔۔۔!!

نصیحتوں اور سنجیدہ اور متین افکار پر غور نہیں کرتے تھے۔۔۔!!

انہیں وہ قیادتیں اچھی نہیں لگتی تھیں جو سچائیوں کی حامل ہوں۔۔۔!!

حق سننا انہیں ہمیشہ ناگوار رہتا تھا۔۔۔!!

اخلاقی اعتبار سے وہ نہایت تندخو اور ناہموار مزاجوں کے مالک تھے۔۔۔!!

معصیت اور عصیاں شعاری میں لذت محسوس کرتے تھے۔۔۔!!

اچھے لوگوں پر پھبتیاں کسنا، ان کا مذاق اڑانا، ان کا شعار ہو چکا تھا۔۔۔!!

وہ اپنی مرضیوں اور خواہشات کے بغیر کسی الہامی میزان کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔۔۔!!

وہ ثبات کے روحی وصف سے محروم تھے۔۔۔!!

یہ تھیں وہ باتیں جنہیں دیکھ کر اللہ کے رسولوں نے ان سے کہا تھا "بل انتم قوم مسرفون"۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ۝

''اور (اتنے میں) آیا شہر کے پرلے سرے سے دوڑتا ہوا ایک شخص اور بولا اے (میری) قوم! پیروی اختیار کرو رسولوں کی''۔

سنگ وخشت سے زمین بوجھل کی جاسکتی ہے لیکن تازہ جہاں پیدا نہیں کئے جاسکتے، یہ زندہ سیرتیں اور جواں جذبے رکھنے والے انسان ہوتے ہیں جن کی زندگی کا ہر لمحہ جفاکیشیوں سے لذت آشنا رہتا ہے۔ نامساعد حالات کے طوفانی جھکڑ ان کے ہاں رسم ہائے عشق کے جلتے چراغوں کی روشنی کم کرنے میں ناکام ہوتے ہیں۔ انہی سچے اور سُچے انسانوں کی نورنوازیاں پتھروں کے دل چیر کر گل خیزیوں کا سامان پیدا کرنے پر قادر ہوتی ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کا آبگینہ دل اگر ٹوٹ جائے تو فطرت پھول کی پتیوں میں رگڑ سے بھی آگ پیدا کردیتی ہے۔ قرآن مجید نے یہاں داعی الی اللہ کے سامنے انسانی مزاجوں کا اختلاف رکھا۔ جس طرح پتھروں کی نوعا نوعی عکاس فطرت ہے۔ ہیروں کی چمک ہو یا سنگ سیاہ کی صلابت، جنس ایک ہے لیکن اوصاف میں فرق ہے۔ بعینہٖ انسانی طبائع میں بھی فرق ہے قرآن مجید کی بتائی ہوئی اس چھوٹی سے بستی کا حال اب دیکھئے کہ ایک طرف رسولوں کی دعوت قبول کرنے کی بجائے دھمکیاں، طعنے اور غم وغصہ کے طوفان اور دوسری طرف اسی شہر کے ایک گوشہ سے دوڑتا ہوا ایک جانثار اپنی زندگی کی سوغات ہتھیلیوں پر رکھے لوگوں کو سمجھا رہا ہے، میری قوم کے نااندیش لوگو! تمھارے سامنے جو لوگ کھڑے ہیں یہ معمولی لوگ نہیں صدیاں کروٹ بدلتی ہیں، زمانہ لذت کش انتظار رہتا ہے، لمحے بے تاب ہوتے ہیں جب ان ہستیوں کا ظہور ہوتا ہے، یہ بے رخی کے قابل لوگ نہیں ہوتے، دل دینے کے لائق ہوتے ہیں۔ دوڑو! ان کی پیروی کرو، دیکھتے نہیں ان کی آنکھوں میں حسن نیت کا نور جگمگا رہا ہے، ان کی پیشانیوں پر انسانی ہمدردی کے نقوش نمایاں ہیں، ان کا لہجہ کوثر وسلسبیل سے دھلا ہوا ہے، ان کی صدائے دلبرانہ پر کوہ ودمن بھی ان کے دامن سے وابستہ ہوا چاہتے ہیں لیکن تم ہو کہ تمھاری سنگ فکریاں ان کی زندگی لینے کے درپہ ہورہی ہیں۔ سورہ یٰس کے اس جملہ ''وجاء من اقصا المدينة رجل يسعى'' میں جو جذب ومستی ہے اس کا اندازہ کوئی ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جسے محبت دینے اور محبت لینے کا کوئی تجربہ ہوا ہو۔ دوردراز سے کسی کا آنا پھر دوڑ کر آنا پھر اپنی جان پیش کرنا اور پھر دوسروں کو بھی سمجھانا کہ یہ پیارے رسول ہیں ان کی تابعداری کرو۔ کیف ومستی کے یہی وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں داعی الی اللہ کو اگر آگ میں بھی ڈال دیا جائے تو وہ گھبراتا نہیں اور اس کی دعوت مؤثر پر صنمستان آباد کرنے والے صنم گروں میں بھی کوئی اللہ کا بندہ پیدا ہوجاتا ہے جو دعوت حق کا پرچم اٹھانے کے لئے ہمہ دم تیار رہتا ہے۔ یہ رسولوں کا فدائی کون تھا جس کے عشق کی عکاسی کتاب حکمت نے کی اور حضور ﷺ

مفردات

وَجَآءَ: جاءنا المرسلون پر عطف ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ پر عطف ہو'' اور آیا'' اس کا معنٰی ہے

مِنْ: حرف جار بمعنٰی ''سے''

اَقْصَا: اس لفظ کا مادہ ''ق ص و'' ہے۔ ''قصاعنہ'' کا معنٰی ہوتا ہے'' وہ اس سے دور ہوا''۔ اقصا انتہائی بعید اور آخری حد تک دور۔ مجازاً کسی چیز یا جگہ کا کنارا بھی اقصا کہلاتا ہے

الْمَدِيْنَةِ: شہر ''اقصا المدينة'' مرکب اضافی

رَجُلٌ: ایک شخص کو رجل پر مقدم کرنا بلاغت کے اعتبار سے آنے والوں کی عظمت اور ثنا کرنے کا اہتمام ہے

يَّسْعٰى: دوڑتا ہوا

قَالَ: کہا

يٰقَوْمِ: اے میری قوم جملہ یقوم ''جاء رجل'' کا بدل اشتمال ہے

اتَّبِعُوا: تابعداری کرو اتباع امتثال اور اپنی رائے کو چھوڑ کر دوسرے کی رائے اختیار کرنا ہوتا ہے، ابن منظور نے لکھا ہے کہ افکار واعمال پر ہر دور میں کسی کا پیرو ہو جانا اتباع کہلاتا ہے

الْمُرْسَلِيْنَ: رسولوں کی جملہ میں مفعول بہ واقع ہوا ہے اور المرسلین پر لام تعریف عہدی ہے

نے بھی فرمایا کہ اُمتوں میں آگے جانے والے لوگ تین ہیں (ا) مومن یٰس (ب) مومن آل فرعون اور (ج) حضرت علی بن ابی طالب، یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے لمحہ بھر کے لئے بھی کفر نہیں کیا(55)۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ حبیب اس کا نام تھا۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ اس جاں نثار حق نے واشگاف الفاظ میں جس بات کی دعوت دی وہ رسولوں کی اتباع تھی جس کا صاف مفہوم یہ تھا کہ ان بزرگ ہستیوں کی غلامی اس طرح کرو کہ ان کا کوئی نقش قدم تمہاری پیروی سے خالی نہ رہے۔ ان کی زباں سے نکلنے والے روحانی نور کو سینے میں جذب کیا جائے، ان کی آنکھوں سے نکلنے والی محبت کی شعاؤں کو دلوں میں پیوست کیا جائے، ان کے وجود سعید کے لمس سے تبرک حاصل کیا جائے، ان کے جاوداں نظریات اور افکار کے لئے سوچوں کی سرزمین کشادہ کی جائے، ان کی پیروی میں اتنے مست ہو جاؤ کہ قرب کا وہ مقام مل جائے کہ رسولوں کا سایہ بھی زمین پر نہ پڑے، یہ ہے ان بزرگوں کا حق جس کا ادا کرنا تم پر لازم ہے۔

دعوت، جواب دعوت اور تائید دعوت کی اس عظیم تاریخ کا تعلق اگرچہ امم سابقہ سے متعلق کسی قریہ اور دیہات سے ہے لیکن جرأتوں کی ان علامات کو جبل ابوقبیس کے سائے میں بھی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ نور دعوت کی یہ تاباں شعائیں حرم اقدس سے بھی نکلتی دیکھی جا سکتی ہیں۔ عظمتوں کی اس باران رحمت کا اثر وادیٔ فاران میں بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ہمت و حوصلہ کے یہ انمٹ نقوش بطحا کے سنگریزوں میں بھی ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ جب قریش رسول اللہ ﷺ کے جانی دشمن ہو رہے تھے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ثور کی سیاہیوں میں عشق لازوال کی روشنی بھرنے کا اہتمام فرما رہے تھے اور مولا علی رضی اللہ عنہ رسالت مآب ﷺ کو الوداع کر کے خود حضور ﷺ کی سیج پر لیٹ رہے تھے۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ پہلے رسولوں کو جانثاری کے نمونے خال خال مل رہے تھے لیکن ہمارے رسول پیارے رسول ﷺ وہ شمع حق تھے جس کے گرداگرد پروانوں کی گنتی اور شمار بتایا نہیں جا سکتا، گویا قرآن مجید مصطفےٰ ﷺ کے دشمنوں کو برملا کہہ رہا تھا کہ تمھاری خیریت اسی میں ہے کہ میرے رسول کی خاک پا کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنا لو۔ تمھارے لئے ان کا ہونے اور ان کا بننے ہی میں سعادتوں کا سویرا طلوع ہو سکتا ہے۔

اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾

''پیروی اختیار کرو اس ذات کی جو تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتی اور وہ سیدھی راہ پر بھی ہیں''۔

گذشتہ آیۂ کریمہ اور اس آیۂ مقدسہ دونوں میں بنیادی طور پر دعوت اتباع دی گئی ہے، لیکن دونوں کے پیرایہ بیان میں ایک اساسی فرق ہے۔ پہلی میں مرسلین کے لئے اتباع کا تقاضا کیا گیا ہے جبکہ دوسری میں صفت اتباع کا تذکرہ ہے، مرسلین کی قید نہیں لگائی گئی۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دوسری آیۂ کریمہ پہلی کا تتمہ ہے لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ دوسری آیۂ کریمہ میں معیار اتباع استدلالی انداز میں پیش کیا گیا ہے اس طرح کہ قرآن حکیم نے بتایا کہ قابل اطاعت اور لائق اتباع وہ شخص ہوتا ہے جس میں دو

مفردات

اتَّبِعُوْا: جملہ فعلیہ مؤکدہ جملہ ماسبق ''اتبعوا'' فعل امر بمعنٰی بات مانو، تابعداری کرو

مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ: جو تم سے مانگتا نہیں من لا یسئلکم کو اجراً پر مقدم کرنا اس حکمتِ بالغہ کے اظہار کے لیے ہے کہ داعی اس قدر بے لوث ہے کہ اس کی ذات منفعتوں کے حصول کی بال برابر بھی رغبت نہیں رکھتی

اَجْرًا: اجر کا اطلاق ہر اس دنیوی نفع پر ہوتا ہے جو کسی شخص کو اس کے عمل کے نتیجہ میں حاصل ہو۔ مال، جاہ اور ریاست سب پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے

وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ: اور وہ خود ہدایت یافتہ ہیں

صفتیں نمایاں طور پر پائی جاتی ہوں: ایک تو وہ ہدایت یافتہ ہو اور دوسرا وہ حریص اور لالچی نہ ہو۔ اس کے تمام کام بے لوث ہوں۔ یہاں پر اگر ہم سرسری طور پر ہدایت کے قرآنی معانی نقل کر دیں تو معیار قیادت کے امتیازات کھل کر ہمارے سامنے آسکتے ہیں۔ عام طور پر ہدایت کا لفظ رستہ دکھانے، منزل پر پہنچانے، نصب العین، قلبی نور بصیرت، سیدھے راستے، دلیل و حجت، نشان راہ اور فعل ہدایت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، مندرجہ معانی کی روشنی میں سورہ یٰس کی یہ آیہ کریمہ صاف طور پر ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ قابل اطاعت ذات وہی ہو سکتی ہے جس میں یہ خصوصیات پائی جاتی ہوں۔

وہ منزل کی طرف بڑھنے والے جمیع راستوں سے واقف ہو اور یہ صلاحیت بھی رکھتا ہو کہ انقلابی راہوں میں سے ایک سیدھا اور زود رسا طریق منتخب کر سکے۔

اپنے ساتھ چلنے والوں کو منزل پر پہنچانے کی صلاحیت سے محروم نہ ہو۔

اپنے روحانی، فکری اور عملی سفر میں واضح نصب العین رکھتا ہو۔

راہ حق کی راستگی کو استدلالی انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو۔

نور بصیرت اور فراست قلبی ایسے خصائص سے متصف ہو۔

اپنے مخالفین کے فکری اور عملی کاموں سے آگاہ ہو اور انہیں راہ راست پر لانے کا لازوال جذبہ رکھتا ہو۔

اپنی فکری منصوبہ بندیوں پر عمل اور تگ و تاز میں سست نہ ہو۔

اپنے کام پر معاوضہ طلب نہ کرتا ہو۔ کرائے کے قائدین اور کرائے کے کارکنوں سے کارخانے تو چلائے جا سکتے ہیں لیکن انقلابی کام نہیں لئے جا سکتے۔

اس کے سامنے فکر سازی اور عمل بندی کے لئے معصوم نمونے موجود ہوں۔ جس کا سادہ مطلب رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہو۔

وہ اپنے فیصلوں میں حواس باختگی کا مظاہرہ نہ کرتا ہو، بلکہ کامل تعقل، تیقن اور دلجمعی سے فیصلہ کرنے کی قوت رکھتا ہو۔

قارئ قرآن ان آیات سے یہ سیکھ سکتا ہے کہ دعوت خیر کے سامنے سنگ دلی اور سنگ فکری سب سے بڑا عمرانی، سماجی، معاشرتی اور دینی جرم ہوتا ہے اور یہ بھی کہ اگر کوئی شخص داعی الی اللہ بن کر نکلے تو ضروری نہیں اس کی راہوں میں حریر و پرنیاں بچھائے جائیں۔ راہ حق میں کیل کانٹوں سے بھی روبہ پیکار ہونا پڑتا ہے اور جہاں بولہبیوں کی ستیزہ کاریاں رخ دعوت موڑنے کی کوشش کرتی ہیں وہاں صدیقی طبیعتیں رکھنے والوں اور علوی قربانیاں دینے والوں کی رفاقت بھی میسر آتی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ استقامت کا مظاہرہ کون کرتا ہے۔

وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٢﴾
ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ
شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿٢٣﴾ ج
اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٤﴾
اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿٢٥﴾ ط

اور نہیں ہے میرے لئے کوئی حق کہ میں بندگی نہ کروں اس ذات کی جس نے مجھے پیدا فرمایا اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے (۲۲)

کیا اللہ کے سوا اوروں کو معبود بنالوں؟ (دیکھتے نہیں) کہ اگر وہ رحمٰن ہی ارادہ کر لے کسی تکلیف کا، تو مجھے کام نہ آئے گی ان کی سفارش ذرہ بھر اور نہ (ہی وہ اس لائق ہیں کہ) وہ مجھے اس سے چھڑا سکیں (۲۳)

(اور اگر میں اسے چھوڑوں) تو پھر تو میں بھی کھلی گمراہی میں جا پڑوں گا (۲۴)

(اور) میں (تو) ایمان لایا تمہارے رب پر تم (بھی میری) سن لو (۲۵)

وَمَالِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٢﴾

''اور نہیں ہے میرے لئے کوئی حق کہ میں بندگی نہ کروں اس ذات کی جس نے مجھے پیدا فرمایا اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے''۔

''نہیں ہے مجھے کوئی حق کہ میں اس ذات کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا''۔اس سر بکف مجاہد کے عزائم، جذبات، ارادوں اور اولوالعزمیوں پر مشتمل خطبے کا حصہ ہے جس نے یکہ وتنہا ہونے کے باوجود رسولوں کے منکرین کے سامنے پوری شجاعت اور بسالت کے ساتھ اسے پیش کیا۔ قرآن مجید نے پہلے اسے ''رجل''کہا جو اس کی قوت وعظمت پر بھی دلالت کرتا ہے اور اس کے اجنبی اور ناشناختہ ہونے پر بھی دلیل مہیا کرتا ہے اور ان دونوں مفہوموں کو اکٹھا کرنے سے یہ معنی بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ عظمت کے لئے ضروری نہیں کہ کسی شخص کو لوگ آبادیوں کے طول وعرض میں جانتے ہی ہوں اور جب تک اس کے پاس شان وشوکت اور کروفر نہ ہو تو وہ کام نہ کرسکتا ہو۔قرآن مجید نے گویا پہلے اپنے پڑھنے والوں کی یہ تربیت کی کہ حق پرستی اور حق آگاہی کے لئے وسائل ضروری ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ ساری زندگی وسائل اور اسباب ہی کے انتظار میں اختر شماری کرتے گزر جائے۔دیکھتے نہیں اس شخص کو کہ ایک بستی میں کس بہادری کے ساتھ نتائج سے مستغنی ہو کر حق گوئی کی آگ میں کود پڑا اور پھر حقائق سے اس طرح پردے ہٹائے کہ مسانید علم پر بیٹھنے والے علماء کی زبانوں سے بھی عموماً یہ نور پارے نہیں نکلتے۔اس عظیم شخص کی دعوت کے محض دو اجزا تھے۔پہلے اس نے رسولوں کی پیروی کا ذکر کیا اور پھر اس کے بعد بیان توحید کی رحمتیں بکھیریں۔بظاہر یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ رسولوں کی پیروی کا ذکر مقدم ہے اور بیان توحید موخر ہے لیکن دیانت سے اگر سوچا جائے تو یہ سمجھ لینا دشوار نہیں کہ رسالت کو چھوڑ کر جن لوگوں نے بھی معرفت الٰہیہ کی منزل طے کرنے کی کوشش کی ان میں سے اکثر گمراہ ہوئے۔نور وفکر سے معمور اس رجل عظیم نے گویا ہمیں یہ بھی بتادیا کہ خدا کی ذات کا حق عبادت بھی اسی صورت میں ادا ہوسکتا ہے جب کسی رسول کی غلامی کا قلادہ گلے میں موجود ہو۔داعی الی اللہ کے اس جملہ ''ومالی''میں بہت زور ہے۔

اور کیا ہے مجھے
آخر میں کیوں نہ عبادت کروں
نہیں ہے میرے لئے کوئی حق

میں بڑی بلاغتیں ہیں۔دعوتی اعتبار سے یہ ضروری ہوتا ہے کہ دوسروں کو راہ حق کی طرف بلانے

مفردات

وَمَالِيَ: اور کیا ہے مجھے

''ما''استفہامیہ ہے اور وضعاً رفع بالابتدا کے لیے ہے اور ''لی'' ''ما'' استفہامیہ سے خبر ہے بلاغت کے اعتبار سے یہاں صنعت احتباک پائی جاتی ہے۔طرز کلام نہایت میٹھا اور دلنشیں ہے۔ اس لیے کہ اپنی ذات کو مخاطب بنا کر دعوت کو مؤثر بنایا گیا ہے۔بعض ائمہ تفسیر نے ''ما'' کو نافیہ بھی تصور کیا ہے

لَآ اَعْبُدُ: کہ میں عبادت نہ کروں

الَّذِيْ: اس کی اسم موصولہ ہے

فَطَرَنِيْ: پیدا کیا مجھے

''فطر'' باب ضرب اور نصر دونوں سے استعمال ہوتا ہے۔اساسی معنی پھاڑ کر پیدا کرنا ہوتا ہے۔''فطر'' انگور کا جب سرا ظاہر ہو۔ ''فطیر'' ہر وہ چیز جو وقت سے پہلے جلدی میں کردی جائے۔ ''فطر'' زمین سے اگنے والے نباتات اور کبھی روزہ دار کے روزہ افطار کرنے کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں پیدا کرنے ہی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔(المنجد)

وَاِلَيْهِ: اور اسی کی طرف

تُرْجَعُوْنَ: تمہیں لوٹ کر جانا ہے

سے پہلے اپنے مسکین نفس کا بھی جائزہ لیا جائے کہ اس بیچارے کے بھی کیا کیا حقوق ہیں۔روحانی لحاظ سے یہ بھوکا پیاسا چیختا رہے اور انسان دعوتی غذا دائیں بائیں تقسیم کرے اور خود کو محروم رکھے۔ یہ انصاف نہیں اب سوچئے کہ ''ومالی'' میں باہر دیکھنے سے پہلے اندر جھانکنے کا سراغ ملتا ہے۔

مفسرین نے اس لفظ کی روشنی میں ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ داعی الی اللہ نے عبادت کے ذکر سے پہلے مخاطبین پر یہ ظاہر کیا کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ میں عبادت صرف رسولوں کے کہنے پر اختیار کر رہا ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب میں اپنے اندر کے انسان سے پوچھتا ہوں کہ واقعتاً مجھے ایسا کرنا چاہئے یا نہیں، تو میرے اندر سے بھی یہ آواز رسا پیدا ہوتی ہے کہ معبود حقیقی تو وہی ذات ہو سکتی ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔گویا میرے ضمیر کی آواز اور رسولوں کی دعوت میں کوئی تفاوت نہیں۔ جب یہ دونوں ہم آہنگ ہیں تو پھر میں کیوں نہ اس الـــہ کی عبادت کروں جس نے مجھے پیدا کیا۔ یہاں یہ بھی خیال رہے کہ قرآن کا یہ رجل عظیم عبادت کا یہ نقشہ برہنہ آسمان کے نیچے کسی جنگل یا کسی غار میں تنہا کھڑے پیش نہیں کر رہا بلکہ اس کے مخالفین اس کے سامنے کھڑے ہیں وہ اپنے ہاتھوں میں پتھر اٹھائے ہیں اور بھنبھناتی بھڑوں کی طرح شور ڈال رہے ہیں۔ ذرا جھک تو اپنے اللہ کے سامنے، پھر ہم دیکھیں تو کیسے عبادت کرتا ہے؟ ایسے ماحول میں یہ شخص ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہہ رہا ہے میرا حق ہی نہیں کہ میں اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت چھوڑوں۔ تیروں کے سائے میں سجدہ زن ہونا، لہراتی تلواروں کے نیچے ذوق عبادت پیدا کرنا، بہت دشوار ہوا کرتا ہے۔ رسولوں کے اس عظیم فدائی کی یہی قلندرانہ ادائیں تھیں جنہیں دیکھ کر قرآن نے اسے مرد کہا۔

وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ

وقوع قیامت اور عقیدہ آخرت کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے لیکن الیہ میں ''ہ'' ضمیر کا مرجع چونکہ ''الذی فطرنی'' والی ذات ہے، جس کا ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ توحید چونکہ ضمیر اور دل کی آواز اور دین مرسلین غالب آنے والا اصدق ہوتا ہے اس لئے میں ہوں یا نہ ہوں وہ وقت آنے والا ہے کہ تم سب اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے، یعنی دین مرسلین دنیا میں غالب آ کر رہے گا۔

ءَاَتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنۡ يُّرِدۡنِ الرَّحۡمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغۡنِ عَنِّىۡ شَفَاعَتُهُمۡ شَيۡـًٔـا وَّلَا يُنۡقِذُوۡنِ ۚ‏ ﴿۲۳﴾ اِنِّىۡۤ اِذًا لَّفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۲۴﴾

''کیا اللہ کے سوا اوروں کو معبود بنالوں (دیکھتے نہیں) کہ اگر وہ رحمٰن ہی ارادہ کرلے کسی تکلیف کا، تو مجھے کام نہ آئے گی ان کی سفارش اور نہ (ہی وہ اس لائق ہیں کہ) وہ مجھے اس سے چھڑا سکیں (اور اگر میں اسے چھوڑوں) تو پھر تو میں بھی کھلی گمراہی میں جا پڑوں گا''۔

مفردات

ءَاَتَّخِذُ: کیا میں بنالوں
استفہام انکاری سے جملہ مستانفہ لایا جا رہا ہے اور اتخذ اتخاذ باب افعال سے ہے بمعنٰی اختیار کر لینا۔ تغیری معنٰی یہ ہوگا کہ یہ ممکن نہیں کہ میں سچے الٰہ کو چھوڑ کر دوسروں کو خدا مان لوں

مِنۡ دُوۡنِهٖۤ: اس کے سوا، اسے چھوڑ کر

اٰلِهَةً: بت بنائے ہوئے خدا، اختیار کیے ہوئے معبود

اٰلِهَةً: مقام حقارت پر ہے

اِنۡ: اگر یہاں سے نفی ماسبق کی تعلیل کے لیے بیان استینافی ہے

يُّرِدۡنِ: ارادہ کرے میرے متعلق

الرَّحۡمٰنُ: رحمٰن

بِضُرٍّ: کسی تکلیف کا ''ضر'' کا اساسی معنٰی تنگ ہونا ہوتا ہے۔ مجازاً مجبور ہونا، تکلیف میں مبتلا ہو جانا، حاجت مند بنا دینا، نقصان میں ہونا اور نقصان پہنچانا اور حسد وغیرہ معنوں میں استعمال ہوتا ہے

لَّا تُغۡنِ: نہ بچائے گی

عَنِّىۡ: مجھے

شَفَاعَتُهُمۡ: اس کی شفاعت وسفارش

شَيۡـًٔـا: ذرہ بھر

وَّلَا: اور نہ

يُنۡقِذُوۡنِ: انقاذ سے ہے اور اس کا معنٰی ائمہ لغت نے لکھا ہے: غم، حیرت، پریشانی اور غلبہ سے خلاصی''

مفردات

اِنِّیْٓ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ: پھر تو میں کھلی گمراہی میں ہوں گا۔ جملہ انی اذ لفی جواب ہے، استفہام انکاری کا اور حرف "اذا" منفی کی جزا ہے نہ کہ نفی کی۔ مفہوم یہ ہوگا کہ اگر میں اللہ کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنالوں پھر تو میں کھلی گمراہی میں ہوں گا

ایسا ماحول جس میں شرک کی آلودگیاں حد انتہا تک جا پہنچیں اور انسانوں کے مریض ذہن نیکیوں اور بدیوں کے الٰہ الگ مانیں، راتوں اور دنوں کے خدا علیحدہ تسلیم کریں، خوشیوں اور غموں میں کام آنے والے صنم الگ تراشیں، نفع اور نقصان کے دیوتا علیحدہ پوجیں، خواہش اور مرضی کے معبود الگ مرکز عقیدت بنائیں رکھیں۔ اس مصنوعی ماحول میں یہ پسند نہیں کیا جاتا کہ لوگوں کی جھوٹی عقیدتوں کے پردے چاک ہوں اور ان کے ضمیروں اور روحوں، سینوں اور دلوں کی بھیانک اور خوف ناک تاریکیاں روح برہنہ ہوں۔ ایسے ماحول میں جب حق پرستی کی کوئی چنگاری روشن ہوتی ہے تو اندھیروں کے یہ مکار محافظ ہر حیلہ اور ہر حربہ استعمال کرتے ہیں کہ کسی طرح نور حق ابتدائی سطح پر ہی نابود ہو جائے، لیکن معاشرتی اور عمرانی علوم کا یہ بنیادی اصول ہے کہ جھوٹ جتنا بھی مسلح ہو کر انسانی ذہنوں پر مسلط ہونے کی کوشش کرے اسے کامیابی نہیں ہوسکتی۔ اب ان حقائق کی روشنی میں "مومن یٰس" کا ایمان دیکھئے، اس کی شجاعت ملاحظہ کیجئے، اس کا استدلالی رنگ آنکھوں میں لائیے اس کا ایک ایک لفظ، ایک ایک کلمہ اور ایک ایک حرف، حکمتوں اور دانش مندیوں کے نور سے لبریز نظر آتا ہے۔ جب اسے مشرکین اپنے جھوٹے دیوتاؤں کی طرف راغب کرنے کی سعی کرتے ہیں، اپنے خود ساختہ خداؤں کی بددعاؤں سے ڈرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے مختلف حیلوں اور بہانوں سے اس "رجل عظیم" کے ذہن میں وسواس اور تشکیک کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ ان نفسیاتی ذہنی حملوں کے مقابلہ میں لرز جائے، اس کے پائے استقامت میں لرزش آجائے اور ان کے ذہن پر وہم وخیال کی بدلیاں چھا جائیں وہ پوری دلجمعی، سکون، صبر، تحمل اور بہادری کے ساتھ بت پرست مشرکین اور رسول دشمن معاندین کو سمجھاتا ہے کہ تمہارا مطلب کیا ہے؟ کہ میں اپنے سچے الٰہ، اپنے خدا، اپنے مالک اور اپنے معبود کو چھوڑ کر تمہارے پتھروں اور سلوں سے بنائے ہوئے بتوں کے چکر میں مبتلا ہو جاؤں۔ یاد رکھو! خدا وہ نہیں ہوتے جو بنائے جاتے ہیں، الٰہ تو وہی ہوتا ہے جو سب کا خالق ہوتا ہے۔

"ء اتخذ"، "کیا میں بنالوں" کے الفاظ نہایت دلچسپ ہیں اور ان میں یہ باریک اور لطیف اشارہ موجود ہے کہ الٰہ وہ ہوتا ہے جو سب کو بناتا ہے۔ سب کی تخلیق اس کے ارادے سے ہوتی ہے اور سب کا مرجع بھی وہی ہوتا ہے۔ اب تمہیں دیکھ کر تمہاری احمقانہ مظلومیت آنکھوں میں لانے کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ میں تمہارے مرض کو اپنے اوپر مسلط کرلوں، تمہارے اندھیروں کو بھی اپنا نور سمجھنے لگ جاؤں اور تمہاری کراہت کو اپنا حسن تصور کرنے لگوں۔ یاد رکھو! میں تو اپنے مالک اور الٰہ ہی کو اپنائے رکھوں گا، مجھے تو اس کے بغیر کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ تمہاری دنیا کی ہر چیز میں اس کی ربوبیت اور رحمتوں کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ چلو ایسے سہی کہ میری بات اگر تمہاری سمجھ میں نہیں آتی تو تم بتادو کہ تم بتوں کے فریب

مفردات

میں کیوں مبتلا ہو، تمہیں تمہارے صنم کیا دیتے ہیں؟ کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ ان میں کوئی ایسا ہے جس نے کوئی حقیر سے حقیر چیز ہی پیدا کی ہو؟ کیا ان میں سے کسی میں یہ سکت ہے کہ تمہاری کسی مشکل میں کام آ سکے؟ حیرت ہے کہ تم ان کی شفاعت اور سفارش کے دھوکے میں مبتلا ہو، حالانکہ ان کی بے بسی، احتیاج اور ضعف تم پر پوری طرح عیاں ہے۔ تمہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ معبود صرف وہ ہو سکتا ہے جس کی صفات میں خالق ہونا، رب ہونا، الٰہ ہونا اور رحمٰن ہونا شامل ہو۔ وہ تمام عوالم کا مبداء بھی ہے اور مرجع بھی۔ یہ دیکھا جائے تو یہ صفتیں صرف اور صرف اسی ذات میں پائی جاتی ہیں جس کا تعارف عظیم اور جلیل رسول کراتے ہیں(56)۔

"ان یردن الرحمن بضر" میں رحمٰن کہہ کر تکلیف پہنچانے کا ذکر از حد دلچسپ ہے۔ مفسرین(57) نے یہاں یہ لکھا "ضـــر" سے مراد عذاب اور عتاب ہے(58) اور رحمٰن کہہ کر عذاب کا ذکر کرنا یہ حکمت رکھتا ہے کہ یوں تو کوئی ایسی مخلوق نہیں جسے اللہ کریم اپنی رحمتوں سے نہ نوازتے ہوں، لیکن کچھ بد اندیش ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی بداعتقادی، بدعملی، بدفکری اور غلط روش سے بذات خود اللہ کی رحمت کو دور کر دیتے ہیں۔ اس نکتہ کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ عفو و درگزر کرنا رحمت ہے، لیکن مسلسل عفو و درگزر ہی سے کام لیتے رہنا ایسی رحمت ہے جس کے نتیجے میں برائیوں اور غلطیوں کی عمر لمبی ہو سکتی ہے اور یہ بذات خود عذاب کی ایک قسم ہوتی ہے۔ گویا اللہ رب العزت نے رحمٰن کے ساتھ "ضـر" کہہ کر یہ سمجھایا کہ تم رحمت کی بہتات برداشت نہیں کر سکتے چہ جائیکہ تم پر زحمت کا عذاب نازل کر دیا جائے اور پھر ایسے میں تمہارے کام کوئی بت آئے نہ کوئی صنم تمہارا سہارا بنے۔

"ء اتخذ، انی، عنی" وغیرہ ہا سب ہی کلمات میں داعی الی اللہ تمام حکمت آموز باتیں اپنی نسبت سے بیان کرتا ہے۔ اس پیرایہ بیان کا مقصد یہ ہے کہ لوگ سمجھ لیں کہ اصولوں کا نور میں اور تو، ہمارے اور تمہارے، نسل اور قبیلے کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ اس میں آفاقیت اور عموم ہوتا ہے۔ ان کے اپنانے سے بلا تخصیص قومیں بن سکتی ہیں اور انہیں ترک کرنے سے بلا تعین ملتیں بگڑ سکتی ہیں۔

قرآن مجید نے یہاں داعی الی اللہ کی زبان سے اصنام اور بتوں کے بارے میں جو دو حقیقتیں سامنے لانا چاہیں وہ یہ ہیں کہ نہ تو وہ اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں کہ ان کی سفارش سن لی جائے اور نہ وہ اتنے قوی ہیں کہ اللہ پکڑے تو وہ چھڑا سکیں۔ یہاں تدبر سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تعمیر اور تخریب کے بھی دو ہی مادے ہیں: ایک قوت اور دوسرا محبت۔ اعتقاد اور عمل دونوں نقطہ ہائے نظر سے قوت کا صحیح منبع مل جائے تو تسخیر کائنات کی جا سکتی ہے اور محبت و میلان کے بے پناہ دواعی میسر آ جائیں تو تسخیر قلوب کا مرحلہ طے کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے ان دو حرکی مادوں کی نسبت اپنی ہی ذات کی

طرف کی۔اس طرح کہ قوت وقدرت صرف اس کی تسلیم کی جائے (59) اور محبت بھی ٹوٹ کر صرف اسی کی ذات سے کی جائے (60) اس کے برعکس قوت کا مصدر سنگ وحجر کو قرار دینا اور محبت کے قابل شجرو مدر کو سمجھنا حقیقت افگنی اور فساد ہے۔ مشرکین کی سب سے بڑی غلطی یہی تھی کہ وہ اصنام کو خدا سے بھی قوی تصور کرتے یہاں تک کہ نبیوں اور رسولوں کو بھی ڈراتے کہ ہمارے دیوتاؤں کو برا کہنے سے دیکھو تم پر کیا وبال نازل ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ خود بھی انھیں سے محبت کرتے اور یہ دعویٰ بھی رکھتے کہ خدا کے چہیتے بھی یہ ہی ہیں۔ یہ دونوں نوعیت کے تصورات اور اعمال صریح بداعتدالی تھی۔قرآن کی زبان میں پرانی کسی بستی میں کھڑے داعی الی اللہ نے گویا آنے والوں کو کھول کر یہ سمجھا دیا کہ جس وقت تم راہ حق میں نکلو تو دو چیزوں کا خیال رکھو: ایک تو یہ کہ کسی کی قوت کا پندار تمہارے لئے فریب نہ بن جائے اور دوسرے کسی کی محبت کا داؤ تمہارے مقصد کی طرف جانے والی راہوں میں رکاوٹ نہ بن جائے۔

قرآن پڑھنے والو!

نفع اور نقصان کا مرجع اپنے معبود کو جانو اور بے نیاز ہو جاؤ، غیر اللہ کے داؤ فریب سے۔اگر تم نے اس طرح ''من دونہ'' کے سارے صنم توڑ دیئے تو دیکھنا تمہاری خوئے استقامت کے بیج سے کتنی دلفریب جنتیں آباد ہوں گی۔ بے جا طوالت کا خطرہ نہ ہوتا تو یہ بھی عرض کر دیا جاتا کہ جس طرح قوت اور محبت سے متعلق بے اعتدالی تباہ کر دیتی ہے اسی طرح قوت ومحبت کے سائے میں عقیدہ وعمل اگر رسولوں کے تابع ہو جائے تو کام کرنے کا بہترین مواد بھی یہ دو چیزیں ہوتی ہیں۔

انی اذالفی ضلل مبین ''میں تو پھر کھلی گمراہی میں جا پڑوں گا'' یعنی اگر میں بھی تمہارے بتوں سے خائف ہو جاؤں، رسولوں کا راستہ چھوڑ دوں، شرک میں مبتلا ہو جاؤں، ناقص عقائد اختیار کر لوں، ضعیف الاعتقادی کا شکار ہو جاؤں، ہر ایرے غیرے کو خدا کے حضور شفیع لانا شروع کر دوں، پتوں کی لرزش میں بھی الوہی واہمے پیدا کروں، تو یہ کھلی گمراہی ہوگی جو کسی بھی طرح کسی بھی دانش مند کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ موت قبول کی جاسکتی ہے لیکن اس بداعتقادی کو اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں یہ لطیف نکتہ ذہن میں رہے کہ اس سے قبل پیغمبروں اور رسولوں کی دعوت نقل کرنے کے بعد قرآن مجید نے ان کی زبان نور سے ایک فصیح اور بلیغ جملے کا حوالہ دیا تھا۔ ''وما علینا الا البلاغ المبین''۔یعنی ان کے دعوتی ابلاغ میں مبین کا وصف ہوتا ہے اور یہاں ملاحظہ ہو کہ موید رسالت کی زبان سے یہ کہلوایا گیا کہ اگر میں ان رسولوں کی راہ چھوڑوں تو ضلالت ہے۔ وہاں ابلاغ کے لئے مبین کا وصف اور یہاں گمراہی کے لئے مبین کی قید کیا حکمت رکھتی ہے۔ ہمارے خیال میں اسے عمل اور ردعمل کے قانون سے سمجھا جاسکتا ہے۔اس طرح کہ یہ حقیقت اب مسلمہ ہو چکی ہے کہ ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے اور یہ

دونوں مخالف سمت میں ہونے کے باوجود یکساں ہوتے ہیں۔ گویا دعوت جس مقدار اور جس تاثیر سے ہوگی اس کے انکار کا نتیجہ بھی اس کے مطابق ہوگا۔ دعوت اگر مبین ہوگی تو اس کے انکار سے گمراہی میں بھی مبین کا اثر پیدا ہو جائے گا۔ چھوٹے لوگوں کی دعوت کا ترک کرنا چھوٹا وبال رہے گا اور بڑی ہستیوں کا دامن چھوڑنے میں اس کا وبال بھی خوفناک اور بھیانک ہوگا۔ اب اندازہ لگالیں وہ لوگ جو رسول رحمت ﷺ کے منکر ہو رہے ہیں ان کے اس انکار کا نتیجہ ان کے حق میں کیا ہوگا۔

اللھم رزقنا حبا لرسولنا و شرفنا بزیارته فی حیاتنا بعد مماتنا آمین

بحرمة سید المرسلین صلی الله علیه و اله واصحابه اجمعین۔

اِنِّیْۤ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾

''اور بے شک میں (تو) ایمان لایا تمہارے رب پر تم (بھی میری) سن لو''۔

رنگ اور نور میں نہائے ہوئے اس انقلاب آفرین جملے میں کتنی استقامتیں اور کتنے حوصلے بھرے ہیں، توہم پرستی سے آزادی کا یہ کتنا حسین اور خوبصورت اعلان ہے، ملحدانہ ماحول میں بصیرتوں اور دانش مندیوں کا یہ کتنا قبول صورت فلسفہ ہے، کفر کی غفلتوں میں مدہوش انسانوں کے لئے یہ کتنی ضیاء ریز اذان ہے۔

اِنِّیْۤ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾

میں ایمان لایا تمہارے رب پر

پس تم کان کھول کر میری باتیں سن لو

ان پر توجہ کرو

اور مان لو

کفر کانٹوں کی طرح قلب و ذہن میں اضطراب پیدا کرنے والی شے ہوتی ہے، ایمان پہاڑوں کی طرح ڈٹنے والی حقیقت ہوا کرتی ہے، باطل برف کی طرح پگھلنے والا مادہ ہوتا ہے اور حق سورج کی طرح چمکنے والا مصدر نور ہوا کرتا ہے۔ حق جس وقت آنکھوں کا نور، دل کا سرور، ماتھے کی زینت، چہروں کا غازہ، سینوں کا حوصلہ اور ارادوں کی ہمت بن جاتا ہے پھر وہ باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیوانہ وار سچ اور راستی کا تعارف کراتا ہے۔ دیکھئے! اس مرد حق آگاہ کو۔۔۔ کہ لوگ اسے لاتوں اور مکوں سے مارنے کی کوشش کرتے ہیں، اسے جلانے کے لئے آگ روشن کی جاتی ہے (61) سنگسار کرنے کے لئے پتھر اکٹھے کئے جاتے ہیں، بدن چیرنے کے لئے آرا لگایا جاتا ہے، زندہ درگور کرنے کے لئے زمین کھودی جاتی ہے۔ اس گمان پر کہ شائد اس طرح یہ شخص مرعوب ہو کر باز آجائے لیکن ایمان کی مستی سے

مفردات

اِنِّیْۤ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ: تمہارے رب پر پس سُن لو

''انی امنت'' خطاب کی غایت کے طور پر واقع ہوا ہے، گویا یہ ایک اعلان ہے کہ اللہ ان کا رب ہے نہ کہ وہ بت اور اصنام اور اسی اعلان کو ''فاسمعون'' کی تفریع سے مؤکد کر دیا گیا ہے (التحریر)

سرشار وہ مردِ مجاہد ان انسانیت دشمن اور پست فطرت لوگوں کو کس جرأت کے ساتھ کہتا ہے کہ

میں تمہارے رب پر

تمہارے رب پر

ایمان لایا

یہاں تمہارا رب کہنے میں جرأت بھی ہے اور دعوت کا نور بھی ہے۔ جو شخص کسی کو نہ مانتا ہو اس کے سامنے اس کا ذکر کرنا جسے وہ نہیں مانتا بلاشبہ بہادری ہوتی ہے۔ وہ لوگ اللہ کا رب ہونا نہیں مانتے تھے۔ ان کے سامنے جرأت سے اللہ کو رب کہنا نہ صرف رب کہنا بلکہ ان کا رب کہنا بڑا حوصلہ ہے، بڑی جرأت ہے۔ یہاں اس میں یہ حکمت بھی پوشیدہ ہے کہ اگر داعی الی اللہ انہیں ربوبیت باری کی طرف میرا رب کہہ کر بلاتا تو وہ کہہ سکتے تھے کہ تو تو اسے اس لئے مانتا ہے کہ وہ تیرا پالنے والا ہے ہم کس لئے اسے مانیں۔ "ربکم" کہنے میں گویا اس بات کا بھی کھلا اظہار ہے کہ اللہ کسی ایک فرد اور کسی ایک شخص کا رب نہیں بلکہ جمیع کائنات اس کی شان ربوبیت سے اکتساب فیض کر رہی ہے۔

بعض دیگر مفسرین(62) نے " انی امنت بربکم فاسمعون" کا ایک دوسرا دلچسپ مفہوم بھی بیان کیا ہے کہ اس مرد حر نے جب دیکھا کہ لوگ اسے شہید کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو وہ رسولوں کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے عرض کی میری آنکھوں کی ٹھنڈک! جان جاں مرسلین!

توجہ فرمایئے!

نظر کرم کیجیئے!

اب آپ کے غلام کا آخری وقت ہے

یہ آپ کے رب کو ماننے والا ہے

مجھے اپنے ایمان پر آپ کی گواہیوں کی ضرورت ہے۔

وہ موت نہیں ہوتی، زندگی کا ایک حسین ترین لمحہ ہوتا ہے جب انسان دنیا سے کوچ کر رہا ہو اور اس کے سامنے تابندہ سیرت رکھنے والے رسولوں کے چہرے موجود ہوں۔ ایسے رسول جن کا وہ کلمہ پڑھتا رہا، جن کے نام کی وہ مالا جپتا رہا۔ کتنا خوش قسمت اور تابندہ بخت تھا وہ مومن کہ اس کے رسول اس کے سامنے موجود تھے اور وہ ان حسین چہروں اور معصوم ہاتھوں سے تسکین محبت کا نور چنتے " انی امنت" کا ورد کرتے دنیا سے کوچ کر رہا تھا۔

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾
بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۷﴾
وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا
مُنْزِلِيْنَ ﴿۲۸﴾
اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿۲۹﴾
يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ
يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۰﴾

فرمایا گیا جا داخل ہو جا جنت میں، وہ کہنے لگا اے کاش! میری قوم کے لوگ جان لیتے (۲۶)
کہ میرے رب نے کس چیز کی وجہ سے مجھے بخش دیا اور شامل فرما دیا مجھے باعزت لوگوں میں (۲۷)
اور نہیں اتارا ہم نے اس کی قوم پر اس کے بعد کوئی لشکر آسمان سے اور نہ ہمیں ضرورت تھی کہ کوئی لشکر
اتارتے (۲۸)
وہ تو بس ایک چیخ تھی جس کے بعد وہ بجھے ہوئے کوئلے بن گئے (۲۹)
وائے افسوس! بندوں کے حال پر نہیں آئے ان کے پاس کوئی رسول مگر وہ ان کا مذاق ہی اڑاتے
رہے (۳۰)

قِیۡلَ ادۡخُلِ الۡجَنَّۃَ ؕ قَالَ یٰلَیۡتَ قَوۡمِیۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِیۡ رَبِّیۡ
وَ جَعَلَنِیۡ مِنَ الۡمُکۡرَمِیۡنَ ﴿۲۷﴾

''جا داخل ہو جا جنت میں، وہ کہنے لگا کہ کاش میری قوم کے لوگ جان لیتے کہ میرے رب نے کس چیز کی وجہ سے مجھے بخش دیا اور شامل فرما دیا مجھے باعزت لوگوں میں''۔

وہ لوگ جن کے رگ و پے میں سچائی سرایت کر جائے، نور کی روشن شعائیں جن کے دل کے دریچوں سے گزرتی رہیں، جن کا مقصودِ زندگی صرف اتنا ہی ہو کہ ان کی کوئی سانس ذکر اللہ سے خالی نہ ہو، جن کا مطمعِ نظر احقاقِ حق ہو، وہ جو زندگی کی چند مستعار گھڑیوں کو بچانے کے لئے ایمان کو داؤ پر نہ لگاتے ہوں، وہ جسمانی زخموں کی وحشت سے ڈر کر اخروی ذلت و راحت سے دست کش ہونا پسند کرتے ہیں۔ انطاکیہ کی رزم گاہ حق و باطل میں جب سچائیوں کا ساتھ دینے والے اس مردِ حق آگاہ نے انوار و برکات کی ہمرکابی کا شرف حاصل کر لیا تو دشمنانِ دین چیلوں اور کوّوں کی طرح اس پر پل پڑے۔ اگرچہ مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ اسے شہید کر دیا گیا یا وہ ان کے ہاتھوں محفوظ رہا، تاہم اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جب وہ راہیِ عدم ہوا، بارگاہِ قدس سے آواز آئی ''قیل ادخل الجنة'' آجاؤ۔۔۔ آجاؤ۔۔۔ سکون کی جنتیں تمہاری منتظر ہیں، راحت کے مزے تمہاری راہ دیکھتے ہیں، ملائکہ نور کے موتی تمہاری آغوش میں ڈالنا چاہتے ہیں، بہشتی حوریں پھولوں کے ہار لئے تمہارے انتظار میں کھڑی ہیں۔ اے شہادت کا تاج سر پہ سجانے والے! دیکھ ذرا دیکھ! نورِ حق بے حجاب ہونے والا ہے، آنکھوں کو اس نور کی لذتِ دید ملنے والی ہے جس کے لئے رات اور دن خود کروٹیں لے لے کر بے تابی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اے شہیدِ حق! تیرا خون رائیگاں نہیں جائے گا، تیرے جسم کے بوند بوند لہو سے ہشت گلزار کھلیں گے۔ ''قیل ادخل الجنة'' موت کے شکاریوں اور شہادت کے مشتاق جواں مردوں کے جنت میں دھوم دھام سے داخلے کا اعلان ہے۔ ''قیل'' کا قائل کون ہے؟ مفسرین اس بارے میں تین قسم کے خیال رکھتے ہیں(63):

قیل کا قائل اللہ رب العزت ہے۔

قیل کے قائل رسول اور مرسلین ہیں۔

قیل کے قائل مستہزئین اور منکرینِ رسالت ہیں۔

اگرچہ ان تینوں اقوال کو سامنے رکھ لیا جائے تو یہ حقیقت اس طرح بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ جب شہید اپنی جان دے کر ''مقصد'' کو اپنے لہو سے قیمتی ہونے کا ثبوت فراہم کر دیتا ہے تو پھر گویا اس کا

مفردات

قِیۡلَ: کہا گیا ائمہ تفسیر نے کہا کہ یہاں ایک مقدر سوال کے جواب میں یہ جملہ کہا گیا۔ وہ مقدر سوال یہ ہے:

ما حاله عند القاء ربه بعد ذلك التطب في دينه

ادۡخُلِ: داخل ہو جا فعل امر حاضر برائے مذکر

الۡجَنَّۃَ: جنت وہ مقام اعلیٰ و ارفع جو اللہ عزوجل اپنے فضل سے قیامت کے دن اہلِ ایمان کو عطا فرمائے گا

قَالَ: کہا اس نے

یٰلَیۡتَ: اے کاش یہ مجموعہ ہے ''یا'' اور ''لیت'' کا ''لیت'' حرف مشبہ بالفعل ہے اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتا ہے اور کبھی کبھار اسم اور خبر دونوں کو نصب دیتا ہے

قَوۡمِیۡ: میری قوم

یَعۡلَمُوۡنَ: جانتے ہوئے

بِمَا: جو یہاں پر ''ما'' مصدریہ ہے

غَفَرَ: لغوی اور اساسی معنیٰ چھپانا اور ڈھانکنا ہوتا ہے، بالوں کی سفیدی کو خضاب سے چھپانا، گناہ معاف کر دینا وغیرہ

لِیۡ: مجھے

رَبِّیۡ: میرے پروردگار

وَ جَعَلَنِیۡ: اور بنا دیا مجھے، کر دیا مجھے

مِنَ: سے

الۡمُکۡرَمِیۡنَ: کرامت والوں میں مراد فرشتے، انبیاء اور افضل الصالحین ہیں مکرمین کو ''را'' مشدد سے بھی پڑھا گیا ہے

مفردات

ماحول، اس کے دوست، اس کے رفقاء، اس کے قائدین اور اس کے دشمن سب یک زبان ہو کر اس کی عظمت فکر کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ فطرت خود "قیل ادخل الجنة" ایسے الفاظ بول کر اسے دلاسہ دیتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ محبوب کے منہ سے آجا!۔۔۔آجا!۔۔۔ کے الفاظ سن کر سو زندگیاں قربان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آیہ کریمہ میں "قیل لہ" نہیں کہا گیا بلکہ "قیل" کہا گیا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ شہید تیرا خون بھی قیمتی ہے لیکن اگر تیرا خدا خود اپنی زبان سے تجھے جی آیا نوں یا خوش آمدید کہے تو پھر اس کا کوئی مول نہیں۔

رہا یہ سوال کہ قرآن حکیم نے شہادت کا ذکر کئے بغیر جنت میں داخلہ کا تذکرہ کیا اس کی حکمت کیا ہے؟ مفسرین نے لکھا کہ یہ اسلوب اس لئے اختیار کیا گیا تا کہ کتاب انقلاب سے حکمت کے پھول چننے والوں کو پتہ چل جائے کہ اسے متکلم نے قابل ذکر ہی نہ سمجھا اور صرف جنت میں داخل ہونے ہی کا ذکر کیا۔

"قال یلیت قومی یعلمون" اصلاح ملت کے گہرے درد اور عمیق احساس کا غماز جملہ ہے(64)، گالیاں کھا کر، دکھ برداشت کر کے، مصیبتیں سہہ کر، کرب جھیل کر اور موت کا جام نوش کر کے یہ احساس ساتھ لے جانا کہ ہائے میری قوم! وائے عدم فکری! اور کاش! یہ داعی الی اللہ کی مقصد سے محبت اور عشق کا انمٹ قرآنی نقش ہے۔ ایسی ہی بردباری، تحمل اور سرد مزاجی، تحریکی عظمت اور دعوتی کامیابی کی بنیاد ہوتی ہے۔ محرکین قوم اگر اپنے دامن طلب میں یہ تحریکی سرمایہ ڈال لیں تو زندگی کے کسی موڑ پر وہ ناکامی نہیں دیکھ سکتے۔

"قال یلیت قومی یعلمون" راہ حق کے شہید نے موت کے وقت اپنی زبان سے ادا کیا یا موت کے بعد۔ جمہور مفسرین کا خیال یہ ہے کہ شہید مقصد کی زبان پر ان الفاظ کا ورد موت کے بعد جنتی زندگی میں ہوا(65)۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ الفاظ مودودی کے ہیں:

> مرنے کے بعد سے قیامت تک کا زمانہ خالص عدم اور کامل نیستی کا زمانہ نہیں ہے جیسا کہ بعض کم علم لوگ گمان کرتے ہیں بلکہ اس زمانہ میں جسم کے بغیر روح زندہ رہتی ہے، کلام کرتی اور کلام سنتی ہے، جذبات و احساسات رکھتی ہے، خوشی اور غم محسوس کرتی ہے اور اصل دنیا کے ساتھ بھی اس کی دلچسپیاں باقی رہتی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو مرنے کے بعد اس مرد مومن کو جنت کی بشارت کیسے دی جاتی اور وہ اپنی قوم کے لئے یہ تمنا کیسے کرتا، کہ کاش! وہ اس کے انجام نیک سے باخبر ہو جائے" (66)۔

قوم کیا جانتی ہوتی؟ اس سلسلہ میں مفسرین کی تین آراء ہیں(67)۔

مفردات

وَمَآ اَنْزَلْنَا: اور نہیں اتارا ہم نے
اس جملہ کا عطف " قیل ادخل الجنۃ" پر ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جملہ کو مستانفہ بنایا جائے
عَلٰى قَوْمِهٖ: اس کی قوم پر
مِنْۢ بَعْدِهٖ: ظرف پر "من" کا استعمال مظروف کے ظرف کے ساتھ اتصال میں تاکید کے لیے ہے اور بعض نے اسے ابتدائیہ مانا ہے " بعد" کی اضافت ضمیر کی طرف مقدر مضاف پر بھی دلالت کرتی ہے۔ اصل میں عبارت یوں تھی: "من بعد موته"
مِنْ جُنْدٍ: لشکر یہاں من تاکید عموم کے لیے ہے
جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ: آسمان سے یہاں "من" ابتدائیہ ہے۔ جملہ میں تین مرتبہ "من" کا استعمال مختلف معنوں میں نہایت حسن رکھتا ہے
وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ: اور نہ ہم بھیجنے والے تھے جملہ معترضہ ہے عتاب منفی اور مثبت کے درمیان
اِنْ: نہیں
كَانَتْ: تھی
اِلَّا: مگر استثنا
صَيْحَةً: چنگھاڑ
"صیحۃ" کو عامۃ القرأ نے منصوب ہی پڑھا ہے، لیکن ابو جعفر نے اسے مرفوع بھی پڑھا ہے

"بما غفر" میں "ما موصولہ" ہے۔
دوسری رائے یہ ہے کہ "ما مصدری" ہے
اور تیسری رائے یہ ہے کہ "ما استفہامیہ" ہے۔
ایک رائے کے مطابق معنی یہ ہوگا کہ اے کاش! میری قوم جانتی ہوتی کہ میرے رب نے کس چیز کی بدولت میری مغفرت کی اور مجھے یہ باعزت مقام بخشا یعنی یہ صبر برداشت، حق گوئی اور حق آگاہی کے جذبے اور اعمال تھے کہ میرے رب نے مجھے اس اعزاز سے نوازا۔ دوسری رائے کے مطابق "بما غفر" میں خود مغفرت مراد ہے۔ اس صورت میں آیۂ کریمہ کا مفہوم یہ ہوا کہ اے کاش! میری قوم جانتی کہ میرے رب نے مجھے بخش دیا ہے اور انعام واکرام کی دولت بے بہا سے نوازا ہے۔ تیسری رائے کے مطابق مطلب یہ ہوگا کہ اے کاش! میری قوم سمجھتی اور قدر کرتی اس وسیلہ کی جس نے مجھ پر مغفرت ربی کے دروازے کھولے یعنی رسولوں کا دامن پکڑنا اور ان کی محبت اور عشق میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دینا۔

جزا بیان کرتے ہوئے قرآن حکیم نے خصوصیت کے ساتھ دو چیزوں کا ذکر کیا۔ ایک گناہوں اور لغزشوں کی مغفرت اور دوسرا اکرام وکرامت کی نوازشیں۔ یاد رہے کہ ایمان اور عمل صالح کا لازمی نتیجہ یہ دو عطیئے ہوتے ہیں مغفرت واکرام۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۵۰

"تو وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک کام کئے، اُن کے لئے مغفرت اور عزت کی روزی ہے"۔ (الحج:50)

ابن عاشور(68) نے لکھا کہ قرآن مجید نے انبیاء، فرشتوں اور افضل الصالحین کے لئے مکرم ہونے کی خلعت خاص رکھی(69)۔ شہیدِ محبت کا مقام کتنا بلند ہوتا ہے کہ اسے رسولوں کی معیت نصیب ہوتی ہے۔ تنظیمی اور تحریکی زندگی میں اس آیۂ کریمہ نے ہمیں کامیابی کے دو اصول عطا فرمائے: ایک کارکنوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں معاف کرنا اور دوسرا ان کی عزت نفس کا خیال رکھنا۔ جو تحریک ان دو باتوں کی ضمانت دے دے اس کے کارکن کبھی اس سے مایوس ہو کر واپس نہیں لوٹتے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ۝۲۸ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ۝۲۹

"اور نہیں اتارا ہم نے اس کی قوم پر اس کے بعد کوئی لشکر آسمان سے اور نہ ہمیں ضرورت تھی

کہ کوئی لشکر اتارتے۔ وہ تو بس ایک چیخ تھی جس کے بعد وہ بجھے ہوئے کوئلے بن گئے"۔

وہ شہر جس میں عمرانی، معاشرتی اور سماجی ترقی کے لئے دیرپا اصول، منفعت بخش ضوابط اور فیض رساں اقدار موجود نہ ہوں۔ انسانی ذہن، فکری اور عملی تربیت کے لئے کوئی ٹھوس لائحہ عمل کارفرما نہ ہو، اس کا مستقبل تاریک ہوا کرتا ہے۔ رسول اور نبی انسانی قیادت کا محض مذہبی اور روحانی معیار نہیں ہوتے بلکہ ان کا وجود معاشرتی ترقی اور عمرانی ارتقاء کی ضمانت بھی فراہم کرتا ہے۔ قرآن مجید نے زیرِ نظر آیات میں ایک ایسے شہر اور بستی کا انجام قاریٔ کتاب کے سامنے پیش کیا ہے، جو مادی دنیا کا نہایت آباد علاقہ تھا۔ وہ ہر دم مادی خوشحالی کی لہروں کی لپیٹ میں رہتا، وہاں کے رہنے والے تجارت میں عالمی منڈیوں کو کنٹرول کرتے، ان کے گھروں میں میٹھے پانی کے چشمے بہتے، ان کی حویلیاں رشکِ ارم بنی رہتیں۔ یہاں یہ خیال رہے کہ ہر مادی ترقی کا عروج روحانی اور اخلاقی تنزل کا مقدمہ ہوتا ہے۔ عام طور پر قومیں جس وقت حالات کی ان وحشت آفرینیوں کی زد میں آ جاتی ہیں۔ ان میں فطرت اصلاحی اور دعوتی تحریکیں اٹھانے کا اہتمام کرتی ہے۔ فطرت کے اسی اصول کی روشنی میں شہر مذکور میں رسول آئے، دعوتیں اٹھائیں اور ہر دم کوشش کی کہ بستی والے اپنے آپ کو تباہی کی آگ سے بچا لیں لیکن یہ انسانی سوچوں کی بدقسمتی ہوتی ہے کہ تکبر افراد کی رگوں میں خون بن کر گردش کرنے لگتا ہے۔ اس شہر کے رہنے والے بھی اس قبیح اور مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے۔ وہ رسولوں ایسی ہستیوں کو حقیر سمجھتے، نا قبول خیالات کا مالک تصور کرتے اور ان کی غربت کا مذاق اڑاتے اور خود اپنے آپ کو آسمان سمجھتے، عظمتوں کا پہاڑ تصور کرتے اور نہ بجھنے والا شعلہ جوالہ خیال کرتے لیکن ان کی شامت اعمال نے ان پر ثابت کر دیا کہ وہ کچھ نہ تھے، نہ آسمان نہ پہاڑ، نہ شہاب اور نہ شعلہ، ان کی تعدیاں اور تعلیاں جب حد انتہا سے گزر گئیں اور وہ رسولوں کو شہید کرنے اور ان کے مؤید و ناصر کو اپنی راہوں سے ہٹانے پر تل گئے اور عملاً ان سے اس کریہہ جرم کا ارتکاب ہو گیا اور ان کے ہاتھوں ایک اللہ والا شہید ہو گیا بس پھر کیا تھا آناً فاناً ایک فرشتہ نے آگ بھری، ایک پھونک ماری، ایک چیخ اٹھی، زلزلہ بپا ہوا اور اپنے آپ کو پہاڑ سمجھنے والے اور شعلے تصور کرنے والے تباہ ہو کر بجھے ہوئے کوئلوں کی مانند ہو گئے۔ بستی والوں کی اس تباہی اور ذلت کا نقشہ قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کھینچا:

"اور نہیں اتارا ہم نے اس کی قوم پر اس کے بعد کوئی لشکر آسمان سے اور نہ ہمیں ضرورت تھی کہ کوئی لشکر اتارتے۔ وہ تو بس ایک چیخ تھی جس کے بعد وہ بجھے ہوئے کوئلے بن گئے"۔

رب کائنات نے ارشاد فرمایا کہ دین دشمنوں کو ختم کرنے کے لئے ہمیں آسمان سے لشکر نازل نہیں کرنے پڑے اور نہ ہی ہمیں ضرورت ہوتی ہے کہ ہم لشکر نازل کریں۔ یہاں امام رازی علیہ الرحمہ

مفردات

وَّاحِدَةً: ایک ہی

فَاِذَا: تو ناگہاں "اذا" یہاں مفاجات کے لیے ہے

هُمْ: وہ

خٰمِدُوْنَ: خمود آگ کا بجھ جانا ہوتا ہے۔ آیت کریمہ میں خمود موت کے لیے استعارہ ہے

نے لکھا کہ ہوا کو پانی ہوتے اور پانی کو ہوا ہوتے، آگ کو برودت میں بدلتے اور برودت کو حرارت میں تبدیل ہوتے پھر بھی کچھ نہ کچھ وقت لگتا ہے لیکن جس وقت اللہ ناراض ہو جاتے ہیں تو پھر زمان و احیان کی طنابیں کھینچ لی جاتی ہیں پھر وقت اور اوقات کا ظرف سکڑ جاتا ہے اور اللہ رب العزت قوموں کو پکڑ لیتے ہیں(70)۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اللہ کریم نے اشارہ فرمایا کہ ہمیں اس بد اندیش قوم پر لشکر نازل نہیں کرنے پڑے۔ علامہ قرطبی نے الجامع میں ایک دلچسپ نکتہ نقل کیا ہے(71)۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہاں تو اللہ رب العزت نے بستی والوں کے لئے ارشاد فرمایا کہ ''ہم نے کوئی لشکر نازل نہیں کیا'' لیکن میدان بدر میں رسالت مآب ﷺ کی پانچ ہزار فرشتوں سے مدد فرمائی اور پھر ایک مقام پر یہ بھی ارشاد فرمایا:

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا (الاحزاب:9)

''اور ہم نے ان پر بھیجے ہواؤں کے طوفان اور لشکر''۔

سوال یہ ہے کہ جب اصول یہ ٹھہرا کہ اسے کسی لشکر کے نازل کرنے کی ضرورت نہیں رہتی تو پھر اس نے یہاں جنود اور لشکر کیوں بھیجے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ اس میں ہمارے حضور ﷺ کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے کہ محبوب ہمیں یوں تو ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ ہم کسی کی تباہی کے لئے لشکر نازل کریں لیکن تیری گستاخی اور اہانت اتنا سنگین جرم ہے کہ ہم ان گنت فرشتے بھی تجھ سے کی جانے والی گستاخیوں کی سزا دینے کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ بعض مفسرین نے آیۂ مذکورہ کو یوں بھی سمجھا ہے کہ بستی والوں کے ناروا سلوک کی بنا پر وہ خود تو ہلاک ہو ہی گئے لیکن ایک مدت مدید اور عرصہ طویل تک اس بستی میں پھر کوئی مصلح اور کوئی نبی نہ بھیجا گیا۔ تفسیر کی اس جہت سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب کی دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک روحانی اور فکری اور دوسری جسمانی اور حسی۔ دونوں ذلت افزا ہوتے ہیں لیکن معاشرے کے لئے کڑا، تلخ اور اشد عذاب اس میں اچھے لوگوں کا پیدا نہ ہونا ہوتا ہے اور فطرت کی اس شدید تعزیر کا درد اور کرب قوموں کو کتنے کتنے طویل عرصہ تک برداشت کرنا پڑتا ہے۔ آیۂ کریمہ نے پوری وضاحت کے ساتھ اچھی قیادتوں کی قدر دانی کا درس چھوڑا۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۳۰

''وائے افسوس بندوں کے حال پر نہیں آئے ان کے پاس کوئی رسول مگر وہ ان کا مذاق ہی اڑاتے رہے''۔

کڑکتے زلزلوں، ہمہماتی فضاؤں، جلتے گھروں، قیامت خیز تاریکیوں، زلزلہ فگن اندھیروں اور دہکتے حالات نے جب زندگی کی شمعوں کو پوری طرح گل کر دیا تو ویران شہر کی ہر شے ''

مفردات

يٰحَسْرَةً: ''حسرۃ'' سخت افسوس اور سخت مصیبت کے معنوں میں ہے ''حسرۃ'' پر حرف ندا کا استعمال مجازاً ہے اور اس کا مقصد مجرد تنبیہ ہے

عَلَى الْعِبَادِ: بندوں پر عباد عبد کی جمع ہے اور عبد مملوک کے معنوں میں آتا ہے۔ یہاں ''عباد'' بشر کے لیے بطور اسم استعمال ہوا ہے

مَا يَاْتِيْهِمْ: نہ آیا ان کے پاس

مِّنْ رَّسُوْلٍ: کوئی رسول

اِلَّا: مگر

كَانُوْا: تھے

بِهٖ: ان کا

يَسْتَهْزِءُوْنَ: '' استہزاء'' سے ہے بمعنی ٹھٹھہ کرنا اور مذاق کرنا۔ جس وقت اس لفظ کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو اس کی شان کے مطابق اس کا معنی سزا دینا وغیرہ ہوگا جیسا کہ قرطبی نے نقل کیا: اصل الا استهزاء الا نتقام

"یحسرۃ" پکارنے لگی۔ زندہ نظریات کو نہ ماننے والی مردہ قوم کی تباہیوں اور بربادیوں کا نقشہ دیکھ کر سنگ وحجر بھی "یحسرۃ" پکارنے لگے۔ بے وقت کی ندامت اور پشیمانی بھی سوائے افزونی درد کے اور کچھ نہ دے سکی۔ بلاشبہ وہ وقت باعث حسرت ہوتا ہے جس میں کوئی قوم مکافات عمل کے قانون میں گرفتار ہو کر اپنا وجود ختم کر بیٹھتی ہے۔ اس موقع پر معاشرہ، تہذیب، تمدن، حضارت، ثقافت، سماج، سوچیں، افکار، اور اقدار سب کے مردہ جسم پر فطرت یاس وحسرت کے کانٹے بکھیرتی ہے۔ منکرین رسالت جب جل کر خاک ہو رہے تھے اور ان کے حمود کے ہمس سے نکلتا دھواں، ان کی لٹتی جوانی اور بکھرے شباب کی داستانیں بیان کر رہا تھا اور خود فطرت بھی "یحسرۃ" کہہ کر ان کے بعد آنے والی اقوام کو سمجھا رہی تھی کہ خدا کو یہ پسند نہیں رہتا کہ وہ خواہ مخواہ کسی قوم کی شمع حیات گل کر دے اور نہ ہی یہ اس کا شوق ہے کہ وہ یونہی بلاوجہ کسی کی زندگی کے غبارے سے ہوا نکال دے، اس کے اپنے طریقے ہیں جن میں وہ ہرگز تبدیلی نہیں کرتا یہاں تک کہ اس کے اظہار الوہیت کی بھی ایک سنت ہے، جس میں کسی قسم کا تغیر اور تبدل نہیں ہوتا۔

"یحسرۃ علی العباد" کا قائل کون ہے؟

ائمہ تفسیر نے اس بارے میں تین اقوال نقل کیے ہیں (72):

یہ کہ اس فقرے کا قائل کوئی نہیں صرف بیان کیفیت ہے

اور یہ کہ "یحسرۃ" کا قائل خود اللہ کریم ہے

اور یہ بھی کہ "یحسرۃ" کہنے والے مسلمان اور فرشتے ہیں۔

اسی طرح "العباد" میں بھی توجیہات کی گئی ہیں کہ یہ کون لوگ تھے جن پر کہنے والے "یحسرۃ" کہہ کر اظہار افسوس کر رہے تھے۔

عامتہ المفسرین کا رجحان تو اسی طرف ہے کہ اس سے مراد عذاب میں گرفتار قوم تھی یا پھر جمیع متکبرین اور کافرین مراد تھے لیکن اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں "العباد" سے خود رسولوں کی ذات ہی مراد ہو (73)۔ اس طرح کہ جس وقت قوم ان کو شہید کر بیٹھی ہو یا انہیں مجبور کر دیا ہو کہ وہ ہجرت کر جائیں اور پھر ان کی عدم موجودگی میں عذاب نازل ہوا ہو، تو پھر انہیں تلاش ہوئی ہو ان قدسی صفت رسولوں کی تاکہ ان کے وسیلہ سے ان کی جان خلاصی ہو جائے، اس موقع پر انہوں نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا ہو "یحسرۃ علی العباد" اے کاش! آج وہ حسین اور معصوم چہرے موجود ہوتے تو ہم ان کے کلام کے نور، ان کی سیرت کی پاکیزگی، ان کی نگاہوں کی لطافت، ان کی مسکراہٹوں کی خوشبو اور ان کے وجود کی رحمت کے وسیلہ سے پناہ طلب کرتے اور یہ غلط بھی نہیں کہ جہنم کی آگ،

دوزخ کے الاؤ اگر سرد ہو سکتے ہیں تو کسی رسول اور نبی کے لب نور کی جنبش ہی سے بجھ سکتے ہیں اور اگر عذاب کا یہ آتش کدہ ٹھنڈا پڑ سکتا ہے تو صرف اور صرف ان کے دامن کرم سے ٹکرا کر نکلتی نسیم فردوس کے وسیلہ ہی سے ٹھنڈا پڑ سکتا ہے۔ یہاں یہ امر بھی ذہن میں رہے کہ کسی قیادت کو یہ فکر نہیں رکھنا چاہیئے کہ اس کے جانے کے بعد تاریخ اس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتی ہے۔ مقاصد کے لئے کام کرنے والی قیادتیں ان سفلی خواہشات سے پاک ہوتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو انسانی خدمت کے حوالہ سے اتنا کارآمد بنا لیتی ہیں کہ زمانہ خود ان کے پیچھے دوڑنے لگ جاتا ہے، ان کی ایک ایک بات محفوظ کر لی جاتی ہے، ان کے جسم کے بال بھی ضائع نہیں ہونے دیئے جاتے، ان کے لباس کے ٹکڑوں کو بھی لوگ صدیوں تک حرز جاں بنائے رکھتے ہیں، میرے خیال میں یہی وہ حقائق تھے جن کی طرف رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث شریف میں ارشاد فرمایا(74):

ان الله حرم على الارض ان تاكل اجساد الانبياء

''بے شک اللہ نے حرام کر دیا زمین پر کہ وہ نبیوں کے جسم کھائے''۔

مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ

قرآن مجید کا یہ جملہ مصطفوی تحریک کے جانباز کارکنوں کے لئے حوصلوں کا صد سامان رکھتا ہے۔ شاید ذہنی اعتبار سے کسی کارکن پر یہ وقت آ سکتا ہے کہ وہ سوچنے لگے کہ میں جس عظیم رسول کے نام کی مالا جپتا ہوں ان کی عظمت کا عالم تو یہ ہے کہ جبرائیل بھی اپنے کافوری لبوں سے ان کے قدمہائے رحمت کے بوسے لیتے ہیں، لیکن سنگ دل انسان ہیں کہ تکذیب کئے جا رہے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ کتاب حکمت نے نیک دل مصطفوی سپاہی کو گویا سمجھایا، تسلی رکھ اور اپنے ذہن کو شکوک اور وسواس سے محفوظ بنا۔ کارگاہ حیات کا یہ دائمی اصول ہے کہ سچائی وہ نہیں جسے جھوٹ محبت سے گلے لگا لے اور نیکی وہ نہیں ہوتی جس کا تعارف خیر، بدی اپنے جامع میں رہ کر کرائے بلکہ صدق اور راستی، نیکی اور بر، وہ نور الٰہی ہے جسے جہالت کبھی برداشت نہیں کر سکتی اور وہ ہر زمانے میں پھر پھر کر اس سیلان نور کو بند کرنے کی سعی کرتی ہے۔ رسول چونکہ پیکر نور ہوتے ہیں، مظہر رحمت ہوتے ہیں، سراپائے خیر ہوتے ہیں، سراج محبت ہوتے ہیں، اس لئے جہالت انہیں کبھی برداشت نہیں کر سکتی اور وہ ہر زمانے میں پہلے موقع پر رسولوں اور ان کی دعوات پر چوٹ لگانے کی کوشش کرتی ہے۔

غور کیجئے! آیہ کریمہ میں ''رسول'' پر تنوین تعظیم کی بھی ہو سکتی اور تنکیر کی بھی۔ دوسری صورت میں ایک قاعدہ یاد رہے کہ نکرہ جب سیاق نفی میں ہو اور اس سے پہلے ''مـن'' بڑھا دیا جائے تو وہ عموم نفی کا فائدہ دیتا ہے(75)۔ اس اعتبار سے ''ما یاتیھم'' کے بعد ''رسول'' سے پہلے ''من'' کا استعمال

مفردات

مفہوم میں عموم پیدا کرے گا اور آیۂ کریمہ کا معنی یہ ہوگا کہ ”کوئی رسول ایسا ہے ہی نہیں جو مبعوث ہوا ہو اور پھر اس کے ساتھ ٹھٹھا اور مذاق نہ کیا گیا ہو، جہالت نے اس پر حملے کرنے کی کوشش نہ کی ہو، مصائب اور آزمائشوں نے اس کا محاصرہ نہ کیا ہو۔ جس طرح اس میں شک نہیں کہ شہد میٹھا ہوتا ہے اور زہر مہلک ہوتا ہے بعینہ اس میں بھی شک نہیں کہ جہالت کو ختم کرو تو اس کی چوٹیں سہنی پڑتی ہیں، اس کی پھبتیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور اس کے حملوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے“۔

اب اگر آپ مصطفوی تحریک کے کارکن ہیں تو متذکرہ آیہ کریمہ کو پڑھیئے، غور سے پڑھیئے۔ بار بار پڑھیئے بلکہ تلاوت کیجیئے۔

مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ دین صرف حریر و پرنیاں کی سیج ہے

اگر آپ کا عقیدہ ہے کہ دین صرف گاؤ تکیئے لگا کر بیٹھ جانے کا نام ہے

اگر آپ سوچتے یہ ہیں کہ دین صرف مزے لینے اور مزے دینے کا نام ہے

اگر آپ نے کہیں سے یہ سن لیا ہے کہ جو دین میں آئے دنیا و آخرت میں بس اسے حوریں ہی گھیرے رکھتی ہیں

تو یہ غلط فہمی ہے بلکہ بدعقیدگی ہے

صاحب! اندھیر نگر میں نور کے انقلاب پیدا کرنے کے لئے رسول بھی ہو تو انہیں چوٹیں کھانی پڑتی ہیں، غم سہنے ہوتے ہیں اور

لوگوں کا غصہ و غضب برداشت کرنا پڑتا ہے

تب جا کر

جنتیں ملتی ہیں

جن میں نہریں رواں دواں ہوتی ہیں

شفاف چشمے ہوتے ہیں

اور لطیف آبشاریں دعوت نظارہ دیتی ہیں

جہاں جب

جو چاہو سو وہ

ملتا ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٣١﴾

وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿٣٢﴾

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴿٣٣﴾

وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿٣٤﴾

کیا وہ دیکھ نہ سکے کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہلاک کیں پھر ان میں سے کوئی ایسا نہ ہوا کہ ان کی طرف واپس لوٹے (۳۱)

اور جتنے بھی ہیں سبھی کو ہمارے سامنے حاضر کیا جانا ہے (۳۲)

اور ایک عظیم الشان نشانی ان کے لئے یہ بے جان زمین ہے، زندہ کیا ہم نے اسے اور نکالا اس سے اناج جس میں سے وہ کھاتے ہیں (۳۳)

اور بنائے ہم نے اس میں باغ کھجوروں اور انگوروں کے اور جاری کئے ہم نے اس میں بعض پھوٹ کر نکلنے والے چشمے (۳۴)

مفردات

اَلَمْ يَرَوْا: کیا یہ نہیں دیکھ سکے
یہ جملہ ''ما یاتیھم من رسول'' کا بیان ہے اور ''یروا'' میں ضمیر عباد کی طرف عائد ہے اور بعض نے یہ بھی جائز رکھا ہے کہ ضمیر کا معاد وہی ہے جو ''واضرب لھم مثلا'' میں ہے۔ سیاق جملہ استفہام تقریری سے ہو رہا ہے

كَمْ: کتنے ''کم'' کی ترکیب میں تین مسلک ہیں: پہلا یہ کہ ''کم'' خبر یہ ہے دوسرا یہ کہ ''کم'' مبتدا ہے اور تیسرا یہ ہے کہ ''کم'' معلقہ ہے

اَهْلَكْنَا: ہلاک کیے ہم نے

قَبْلَهُمْ: ان سے پہلے نحوی اعتبار سے اس اعتبار سے معنی ہوگا ''قبل وجودھم''

مِّنَ الْقُرُوْنِ: زمانے، قومیں جو ایک ہی زمانے میں رہ رہی ہوں

اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ: جملہ اھلکنا سے بدل اشتمال ہے، بے شک وہ ان کی طرف

لَا يَرْجِعُوْنَ: نہیں رجوع کرتے

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٣١﴾

''کیا وہ دیکھ نہ سکے ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہلاک کیں پھر ان میں سے کوئی ایسا نہ ہوا کہ ان کی طرف واپس لوٹے''۔

الم یرو!
کیا وہ دیکھ نہ سکے!
کیا وہ جان نہ سکے!
کیا یہ ان کے علم میں آ نہ سکا!

نہایت لطیف، روح پرور، فکر رسا اور بلیغ فقرہ ہے۔ دیکھنے کے لئے آنکھ چاہیئے، جاننے کے لئے عقل درکار ہے اور علم کے کے لئے سوز دل کی ضرورت ہے۔ گویا اللہ رب العزت نے یہاں قاریٔ قرآن کی توجہ تین چیزوں کی طرف مبذول کرائی۔ ایک تو یہ کہ منکرین رسالت اس قدر شقاوت کا شکار ہو چکے ہیں کہ ان میں غور و فکر اور تدبر کا مادہ ختم ہو چکا ہے۔ ان کے سر ہیں لیکن پتھر کی طرح محض حجم رکھتے ہیں، ان کی آنکھیں ہیں لیکن مٹی کا ڈھیلا بن چکی ہیں، ان کے دل ہیں لیکن صرف انتقال خون کے عضو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دیکھنا اور پھر نتائج تک رسائی حاصل کرنا، جاننا اور پھر تعمیر کردار کا اسے ذریعہ بنانا، اس سے کوسوں دور ہو چکا ہے۔ حیوانوں کے سامنے بھی اگر کسی حیوان کو گرا کر اس کے گلے پر چھری چلائی جائے تو دوسرے دیکھنے والے حیوان ڈر سے لرز جاتے ہیں اور انہیں اپنی جان کی فکر پڑ جاتی ہے، لیکن یہ انسان کیسے انسان ہیں کہ ان کے سامنے بستیوں کی بستیاں تباہ کی جاتی ہیں۔ وہ خود دیکھتے ہیں کہ نافرمان انسان جل جل کر خاک ہو رہے ہیں۔ آبادیوں کی اینٹ سے اینٹ بجائی جا رہی ہے لیکن یہ مردہ فکر لوگ سبق حاصل کرنے کا نام تک نہیں لیتے۔

دوسری چیز یہ کہ مکافات عمل کے قانون سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔ ''جیسا کرو گے ویسا بھرو گے'' کی حقیقت کارگاہ حیات پر گذرنے والے داستان کے ایک ایک حصہ سے چنی جا سکتی ہے۔

اور تیسری یہ کہ قرون اولیٰ کے بستیوں اور آبادیوں کی تباہی کیوں ہوئی؟ انہوں نے کیا وطیرہ اپنایا جس پر فطرت نے ان سے منہ موڑ لیا اور وہ ذلت اور نکبت کے عذاب میں گرفتار ہو گئے۔ گویا اللہ کریم نے صاف طور پر فرما دیا کہ سچائیوں اور ہمہ گیر صداقتوں سے بے رخی برتنے والی قومیں کبھی تباہی سے بچ نہیں سکتیں۔

اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ

تباہی اور بربادی کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض بربادیاں ایسی ہوتی ہیں جن سے بچ نکلنے کی اُمید کی جاسکتی ہے اور بعض ایسی کہ وہ پھر دوبارہ اٹھنے نہیں دیتیں۔ مالک کائنات نے اس فقرے میں اپنے عذاب کی سنگینی بیان فرمائی کہ پھر ان میں ایسا کوئی بھی نہ ہوا کہ واپس لوٹ آئے اور اہل واحباب کے ساتھ زندگی کی رونقوں سے لطف مند ہو(76)۔ امام رازی نے ایک اور احتمال بھی یہاں نقل کیا کہ آیہ کریمہ کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم نے کتنی ہی بستیوں کو ہلاک کیا تا کہ زندہ بچنے والے لوگ مرنے والوں کے عقیدہ کی طرف دھیان نہ دے سکیں(77)۔

وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۲﴾

''اور جتنے بھی ہیں سبھی کو ہمارے سامنے حاضر کیا جائے''۔

''محضرون'' کا معنی آئمہ تفسیر نے ''معذبون'' سے بھی کیا(78) یعنی ان کی ہلاکت سے یہ تصور پیدا نہ ہوا کہ اب ایک مرتبہ انہیں تباہ کر کے سلسلہ عذاب منقطع کر دیا گیا بلکہ معاملہ یہ ہے کہ موت ان کے لئے انتہائے کار نہیں۔ وہ اب بھی اپنے خدا کے سامنے ہیں۔ خصوصاً وہ وقت جب جمیع انسانوں کو اللہ کی کچہری میں کھڑا کیا جائے گا وہ بھی پھر سے عذاب کے لئے حاضر کر دیئے جائیں گے۔ ''جمیع'' کا مفہوم مجموع ہوگا۔ یہ ترکیب ایک دلچسپ نقطے کی حامل ہے۔ وہ اس طرح کہ اللہ کی ذات جہاں یہ قدرتیں رکھتی ہے کہ ان سب کے سب کو اپنے سامنے لا کھڑا کرے وہاں ان سب کو اکٹھا کھڑا کرنے کی اس کے ہاں یہ حکمت بھی ہے کہ انسانوں کے لئے حقیقت سے فرار کی مختلف وجوہ میں سے ایک رنگ وناموس کا مسئلہ بھی ہے اگر انہیں ایک دوسرے کے سامنے مبتلائے عذاب کیا جائے تو کرب کی کیفیات دوگنا ہو جائیں گی۔ اصل میں مدعا عذاب کی شدت بیان کرنا ہے۔

آیۂ کریمہ میں وقوع آخرت کے یقینی ہونے کو بھی سامنے لایا گیا ہے(79)۔ اکابر مفسرین نے اسی کی رعایت رکھتے ہوئے یہاں عربی کا ایک شعر نقل کیا ہے(80)۔

ولو انا اذا متنا ترکنا لکان الموت راحته کل حیی

ولکنا اذا متنا بعثنا ونسئل بعده عن کل شیئی

''اگر موت کے بعد ہمیں اس حالت میں چھوڑ دیا جاتا تو موت تمام زندوں کے لئے راحت ہوتی لیکن ہمیں ہماری موت کے بعد پھر زندہ کیا جائے گا اور پھر ہر چیز کے متعلق پوچھ ہوگی''۔

''محضرون'' کا معنی ''احضار للحساب'' بھی کیا گیا ہے(81) یعنی حساب کے لئے حاضر کرنا وغیرہ۔ تعبیر کا فرق ہے مفہومات سب یکساں ہیں۔

مفردات

اِنْ: نافیہ بمعنٰی نہ یا نہیں

كُلٌّ: سب۔ مبتداء اس میں تنوین عوض ہے مضاف الیہ کا

لَّمَّا: اس وقت۔ الا کے معنوں میں آرہا ہے۔ ابوعبداللہ رازی نے یہی کہا ہے

جَمِيْعٌ: سب کے سب مبتدا کی خبر ہے۔ یہ فعیل کے وزن پر مفعول کے معنوں میں ہے

لَّدَيْنَا: ہمارے پاس

مُحْضَرُوْنَ: احضار سے ہے بمعنٰی حاضر کیے ہوئے اور دونوں قراٰتوں پر یہ جمیع کے لیے مقام نعت میں ہے

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾
وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿۳۴﴾

''اور ایک عظیم الشان نشانی ان کے لئے یہ بے جان زمین ہے۔ زندہ کیا ہم نے اسے اور نکالا ہم نے اس سے اناج جس میں وہ کھاتے ہیں۔ اور بنائے ہم نے اس میں باغ کھجوروں اور انگوروں کے اور جاری کئے ہم نے اس میں بعض پھوٹ کر نکلنے والے چشمے''۔

اب تک سورۂ یٰس میں فرستادگان الٰہی کی دعوتی جدوجہد کے نتیجہ میں پیش آمدہ حالات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا۔ نہایت دل نشین پیرایوں میں یہ بات واضح کی گئی کہ انسانی کائنات کی فلاح وصلاح اس میں مضمر ہے کہ وہ فخر مرسلین مصطفیٰ کریم ﷺ کی معرفت حاصل کرے اور پھر ان کے دامن کرم سے وابستہ ہوکر فائز المرام زندگی کا تصور اجاگر کرے۔ ہر شخص عقیدہ توحید کو جاننے اور ماننے والا ہو، دلوں کی سرزمین حسن ایمان کی بارش سے دھل جائے، شرک اور بت پرستی کا خاتمہ ہو جائے، خواہشات اور مرضیوں کو نہ پوجا جائے بلکہ ایک الٰہ کی عبادت کا وہ نقشہ قائم ہو کہ آسمان تصور وتخیل سے بھی غیرت کی بدلیاں چھٹ جائیں، دنیا مسافر خانہ نظر آئے اس میں حرکت کرنے والا ہر شخص عدم کا مسافر دکھائی دے، جس کا دنیا سے زیادہ آنے والے یوم آخرت پر ایمان مستحکم ہو، اچھے انسانوں کی قدر کی جائے اور بدی مست لوگوں کو مائل بہ احسان کرنے کی کوشش ہو، توحید، معاد، دعوت، رسالت اور خیر وصلاح کے اسی قرآنی نظام پر متذکرہ آیات میں عالم تکوین سے استشہاد کیا گیا۔ کون ومکان کے تخلیقی سلسلوں میں قدرت الٰہیہ کی پھیلی ہوئی ان گنت نشانیاں لوگوں پر واضح کی گئیں۔ صفحہ دل پر انعامات واحسانات کے سپاس آفرین بیان کا نور بکھیرا گیا اس لئے کہ بھولے بھٹکے انسان منزل کا سراغ پالیں اور اپنی زندگیوں کو مقاصد کی روشنیوں سے جگمگا سکیں۔ خدا ان سے قریب ہو اور وہ خدا سے قریب ہو جائیں اور پھر یہی قرب کی مستیاں اور تقرب کے احساسات، روحانیت کے ولولے اور چاہتوں کے درد مضبوط معاشرتی زندگی کی اساس بن جائیں۔ رب کائنات نے ارشاد فرمایا:

واية لهم ''اور ان کے لئے عظیم الشان نشانی ہے''

بھٹکے ہوئے ذہنوں، الجھی ہوئی سوچوں، درشت دماغوں، ناہموار دلوں اور بے احساس ضمیروں کے لئے یہ کافی تھا کہ وہ زمین جیسی بے جان چیز ہی میں غور وفکر کر لیتے اور دیکھ لیتے کہ یہ کتنی بڑی نشانی ہے۔ ''آیـــة'' پر تنوین تفہیم کی ہے، جو عظمت دلیل کی طرف اشارہ ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ الارض المیته احییناها (بے جان زمین جسے زندہ کیا ہم نے) میں پھیلے ہوئے استدلالی طرز کی طرف اشارہ ہو۔

قرآن مجید نے مردہ زمین اور پھر اس کے زندہ ہونے کو بطور ''آیـــه'' پیش فرمایا۔ اس عظیم نشانی

مفردات

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ: اور نشانی ہے ان کے لیے
خبر مقدم اور موصوف صفت ہو کر مبتداء موخر ہے بصورت ''الارض المیتة'' کے
الْاَرْضُ: زمین
الْمَيْتَةُ: مردہ
اَحْيَيْنٰهَا: ہم نے زندہ کیا اسے
نافع اسے تشدید کے ساتھ پڑھتے تھے اور دیگر قراء سے تخفیف کے ساتھ پڑھتے تھے الارض کی خبر بھی ہو سکتی ہے اور حال بھی اور یہ بھی ممکن ہے کہ استیناف بیانی ہو
وَاَخْرَجْنَا: اور نکالا ہم نے
مِنْهَا: اس سے
حَبًّا: غلہ
فَمِنْهُ: اس سے
يَاْكُلُوْنَ: وہ کھاتے ہیں
وَجَعَلْنَا: اور بنایا ہم نے
فِيْهَا: اس میں
جَنّٰتٍ: باغ
مِّنْ: سے
نَّخِيْلٍ: کھجوروں
اسم جمع ہے ''نخل'' کا
وَّ: اور
اَعْنَابٍ: انگوروں سے جمع ہے ''عنب'' کی
اس کا اطلاق انگور کی بیل اور پھل دونوں پر ہوتا ہے
وَّ: اور
فَجَّرْنَا: جاری کیے ہم نے
فِيْهَا: اس میں
مِنَ الْعُيُوْنِ: چشموں سے

مفردات

اور علامت سے معرفت کا نور حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم غور کریں کہ جلی کٹی اور بنجر زمین میں اگر روئیدگی اور نباتات کے حیاتیاتی سلسلے دراز ہو سکتے ہیں تو کیا دلوں کی مردہ زمین کو حسن اعتقاد کے نور سے مزین نہیں کیا جا سکتا۔ جو خدا زمین کو رواں دواں آبی سلسلوں اور بارانی رحمتوں سے حیات عطا فرماتا ہے، وہی خدا دلوں اور دماغوں کو حسن احساس و ایمان سے رونق بخشنے کے لئے نبی، رسول اور کتابیں بھیجتا ہے۔

بلکہ سچ یہ ہے کہ ایک مردہ مٹی بھی یہ استحقاق رکھتی ہے کہ اسے زندگی کی گرمیاں عطا ہوں تو زمین پر چلنے پھرنے والے انسان زیادہ مستحق ہیں کہ ان کی تعلیمی اور تربیتی ضرورتیں پوری کر کے انہیں حیات جاوداں عطا کی جائیں اور پھر اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ تماشا گاہ حیات میں یہ ناممکن نہیں کہ پست کو بالا کر دیا جائے، اور بالا کو پست بنا دیا جائے، مادہ حرارت میں تبدیل ہو جائے، اور حرارت مادہ بن جائے، دریا خشکی میں تبدیل ہو جائیں اور خشکیوں سے آبی ذخیرے پھوٹ پڑیں۔ یہ مشاہدہ حق کے جلوے مردہ زمین میں بخوبی ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے باریک ذروں میں ایٹم کی قوت پوشیدہ ہے اور اس کے ایٹمی ذروں میں موت کی لہریں بھی موجود ہیں، اور برق و بجلی کی زندگیاں بھی کارفرما ہیں۔ اس کے پھلوں میں زندگی کے سامان بھی ہیں اور اس کے آتشی سیلابوں میں موت کے زلزلے بھی پوشیدہ ہیں، گویا یہ زمین نہیں عبرت گاہ ہے۔ اگر یہاں یہ سب کچھ ممکن ہے تو مردوں کو زندگی مل جانا بھی ممکن ہے(82)۔ یہاں صرف حیات بعد الموت کی طرف اشارہ ہی نہیں بلکہ قانون مجازات کا مؤثر بیان بھی ہے۔ دیکھتے نہیں کہ زمین سے اُگنے والے درخت، بوٹے اور شجر سب خاص خاص موسموں کی مناسبت ہی سے ایک وقت گزرنے کے بعد پھل دیتے ہیں۔ موسموں کے تغیر و تبدل میں خاص خاص کیفیات اور نوادر و نتائج ہماری توجہ اس طرح مبذول کراتے ہیں، کہ جب آخرت کا موسم آئے گا تو ہر شخص نیکی اور بدی کے بیج سے اگنے والی فصل کاٹ لے گا۔

"اٰیۃ لھم" "ھم" ضمیر کا مرجع "عباد" ہیں یعنی مردہ زمین کا نشانی ہونا صرف ان لوگوں کے لئے جو مبدا و معاد سے متعلق مسائل میں غلط فہمی کا شکار ہیں۔ یہاں "عبـــاد" سے مراد رسول اور مرسلین نہیں اس لئے کہ وہ تو آفرینش کائنات سے پہلے ہی مومن ہوتے ہیں یہاں خطیب شربینی نے صالحین اور اولیاء کرام کو بھی مستثنیٰ کر دیا(83)۔ ہمارے خیال میں اگر " عباد" کے زمرہ میں صالحین کو شامل کر بھی لیا جائے تو فرق نہیں پڑتا اس لئے کہ کائنات عبرت اور فکر کے لئے کھلی کتاب ہے۔ جس سے استفادہ ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کرتا ہے۔ دھوپ اور چھاؤں، رات اور دن، نور اور اندھیرے کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ

یہ حصہ بیان نعمت بھی ہے اور دلیل وحدت بھی۔ سخت زمین کو اناج اگانے کے قابل بنانا۔ حسب ضرورت پودوں کی جڑوں میں پانی پہنچانا، گٹھلی کا پھاڑنا اور اس سے ہرا بھرا پودا پیدا کر دینا، آفات سماوی سے پھر اسے محفوظ رکھنا، پودوں کو ضرورت کے مطابق روشنی فراہم کرنا، تزریع کے لئے ہواؤں میں مدوجذر پیدا کرنا، افادی تنوع کے لئے موسموں کو متغیر کر دینا، زمین کا آغوش بنا دینا اور آسمان کا چھت کر دینا، جہاں نباتات نہیں اُگتے ان جگہوں کو سکونتی ضروریات فراہم کر دینا، غرض یہ کہ لالہ وگل کے اُگنے سے لے کر اوس وشبنم کے گرنے تک، رقص کرتی ندیوں سے لے کر اچھلتی کودتی آبشاروں تک، مست وبے خود چشموں سے لے کر فیض پرور جھرنوں تک، ہر چیز اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور توحید کی دلیل بن کر سامنے آرہی ہے۔ آفرینش کائنات کے یہ منظم تکوینی سلسلے جس حسن تدبیر پر دلالت کرتے ہیں کیا ان سے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ توازن وتناسب کے یہ انداز کسی ایک ہی ذات کے حسن وارادہ کے مرہون منت ہیں اور پھر ''منہ یاکلون'' سے مضراب انسانیت کی ایک ایک تار کو حرکت دی گئی ہے کہ انسان جس کا کھاتا ہے اسی کے گن گاتا ہے اگر چہ یہ سادہ سا اصول نا قابل فہم نہیں تو فطرت پوچھ رہی ہے کہ یہ رسیلے پھل اور خوش ذائقہ اثمار، یہ دودھ ذائقہ پانی اور یہ شیریں مشروبات تمہیں کون فراہم کرتا ہے اگر اس میں شک نہیں کہ یہ اللہ ہی ہے جو نعمتوں پر نعمتوں کی بارشیں برسائے جا رہا ہے تو پھر یہ مان لینے میں کیا مضائقہ ہے کہ عبادت کے لائق بھی وہی ہے اور وہی اس قابل ہے کہ اس کے انوار کو اپنے جذبوں کی طواف گاہ بنایا جائے۔

''منہ'' کو ''یاکلون'' پر مقدم کرنا اقتصادی زندگی میں نباتات کی اہمیت اور افادیت واضح کر رہا ہے۔ جو قومیں سنجیدگی کے ساتھ قدرت کے ان عطیات سے فائدہ حاصل کرتی ہیں انہیں کبھی معاشی بحران ذلت کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ المیہ یہ ہے کہ لاکھوں مربع میل زمینیں بنجر پڑی ہیں لیکن انسانوں کو کون سمجھائے کہ انہیں آباد کر کے بھی ''منہ یاکلون'' کا اقتصادی اصول آزمایا جا سکتا ہے۔

وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ

ہر شے اپنے مقام پر اپنے رب کی دی گئی نعمت عظمیٰ ہے۔ ریگزاروں کی تپش، چٹانوں کا تناؤ، باد سموم کی جھڑکیاں، بیابانوں کی وسعتیں، صحراؤں کی پنہائیاں، دریاؤں کے بہاؤ، خارزاروں کی خود فریبیاں، کوئی بھی شے ایسی نہیں جس کے باطن میں جھانک کر حقیقت کا سراغ نہ لگایا جا سکتا ہو، لیکن نقاش فطرت نے معرفت اور آگاہی کے لئے یہاں سرسبز باغات کو چشم حق بیں کے لئے اپنے انوار کی

مفردات

جلوہ گاہ قرار دیا۔ مشاہدہ حق کا ذوق اگر اپنی تمام تر بے تابیوں کے ساتھ کسی باغ کو اپنی گزرگاہ بنالے تو وہاں سہانے مناظر، نشاط انگیز فضائیں اور دلفریب نظارے اپنے حسن مآب خالق کو دیکھنے کی تڑپ پیدا کر دیتے ہیں۔ وہاں سے پھوٹتے چشموں کو دیکھ کر کوثر و تسنیم کی دلربا لہریں حسن و مستی کا رنگ بانٹتی ہیں اور انسان اپنے آپ کو خدا سے قریب محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔ لانبے لانبے درختوں کے سائے میں گرتی آبشاریں وہ نغمے چھیڑتی ہیں جیسے یہ پیغام سنا رہی ہوں کہ ناقدر انسان! تو غافل ہے اور تجھے تیرا الٰہ ڈھونڈ رہا ہے۔ پھولوں کی صحبت دماغوں کی آلودگیاں دور کر کے وہ لطافتیں عطا کرتی ہیں کہ رگہائے گل بھی رشد و ہدایت کی خیرات بانٹتی پھرتی ہیں۔ بیل بوٹوں کی جھکی جھکی شاخیں جب پانی کے گہواروں میں جھولے جھولتی ہیں تو ایسے لگتا ہے جیسے رنگ اور نور کی پریاں رقص کر رہی ہوں اور اپنے انداز ہائے دلبری سے جام معرفت تقسیم کر رہی ہوں۔ سچ یہ ہے کہ باغات کے پرفضا مناظر میں، ستاروں کی چھاؤں میں، جب صبح بن ٹھن کر در دل پر دستک دیتی ہے تو کور ذوق انسانوں کے سینے میں بھی یاد الٰہی کی جذبے پیدا ہو جاتے ہیں۔

یاد رہے کہ قرآن مجید نے جہاں باغات کے حسن و توازن کو بطور دلیل اور نشانی بیان فرمایا وہاں کھجور اور انگور کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا وہ بھی اس طرح کہ کھجور کے درخت اور انگور کے پھل کا تذکرہ کر کے ان کی عمومی منفعتوں کی طرف بلیغ اشارے فرمائے۔ کھجور کی جڑوں سے لے کر اس کے پتوں تک اور انگور کے پھل سے لے کر اس کے مختلف مشروبات تک ہر ایک میں جو روحانی اور مادی نعمتیں شامل ہیں گویا ان میں غور و فکر کی دعوت دے کر منزل کی سراغ رسانی کا سبب مہیا کیا گیا۔ غذائی ماہرین کا خیال ہے کہ دماغ کے لئے جتنی کھجور مفید ہوتی ہے اتنی کوئی دوسری غذا نہیں ہو سکتی۔ اس کے اندر فاسفورس موجود ہے جس سے دماغ کے بہت اہم عناصر تشکیل پاتے ہیں اور اس کا کیلشیئم ہڈیوں کو مضبوط اور پختہ کرتا ہے۔ کھجور میں پوٹاشیئم کی بھی خاصی مقدار موجود ہوتی ہے جو السر کا بہترین علاج ہے۔ وہ لوگ جو کھجور کا اکثر استعمال کرتے ہیں وہ سرطان سے بچے رہتے ہیں(84)۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کھجور میں میگنیشیم بھی ہوتا ہے۔ انگور کی بھی یہی صورت ہے کہ اس کا شیرہ ماں کے دودھ کی سی لذت اور قوت رکھتا ہے۔ کارگاہ زندگی کے معمار ازلی نے جس خوبصورتی اور نفاست کے ساتھ ایک باریک جھلی میں پیک کیا وہ بذات خود اس کی کاریگری اور صنعت کی ایک عمدہ دلیل ہے۔

وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ

"فجرنا" تفجیر سے ماخوذ ہے۔ جس کا معنی پھوٹ کر نکلنا اور کھلا شگاف پیدا کرنے کے ہوتے ہیں۔ زمین سے چشموں کا اُبلنا، جھرنوں کا ٹیلوں کی تہہ سے بہہ نکلنا، زمین کے بعض حصوں کا خشک ہونا

مفردات

اور بعض حصوں پر حسین آبشاروں کا اٹھکیلیاں کرنا، اللہ کے حکیمانہ نظام پر خوبصورت اور سکون بخش دلیلیں ہیں۔ طبیعت میں اگر جمود اور نظریاتی سستی نہ ہو تو جہاں مردہ زمین لوح تعلیم ثابت ہو سکتی ہے وہاں کے اس کے آبی وسائل کا حسین نظام بھی سچائیوں کی منزلِ نور تک رسائی حاصل کرنے کے لئے گرہ کشا ثابت ہو سکتا ہے۔ ''تفجیر'' اس پورے آبی نظام کی طرف اشارہ ہے جس سے بے جان زمین زندگی حاصل کرتی ہے۔ کرہ ارض پر اس وقت پانی کی کل مقدار ساڑھے بتیس کروڑ مکعب میل ہے (85) جس میں 97.2% سمندروں کا کھاری پانی ہے اور 2.8% صاف اور میٹھا پانی ہے۔ سمندروں کا کھاری پانی بخارات بن کر بادلوں کی شکل اختیار کرتا ہے اور گھنگھور گھٹاؤں سے نچڑنے والا آب صافی زیر زمین ندی نالوں اور دریاؤں اور چشموں تک پہنچنے کے بعد پھر رواں دواں سمندروں تک جا پہنچتا ہے۔

اس تفجیر کے عمل میں دست قدرت انسانوں کے استعمال کے لئے میٹھے پانی کا بندوبست کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص ہٹ دھرم اور ضدی نہ ہو تو اس آبی سائیکل (Hydrological Cycle) کو دیکھ کر اس دست حق کی حکمتوں کا دل سے قائل ہو جاتا ہے اور اس طرح ادراک کے ارتقا سے توحید پر اس کا ایمان حق الیقین کے درجے پر جا پہنچتا ہے۔ یہاں یہ ذہن میں رہے کہ قرآن مجید کا مقصد یہ نہیں کہ وہ اپنے قاری کو سمندروں کے طول و عرض کی سیر کرائے اور اس کے سامنے دریاؤں اور سمندروں میں غوطہ زنی کی فضیلت بیان کرے۔ کتاب حکمت بنیادی طور پر اپنے پڑھنے والے کو غور و فکر اور تدبر کا اساسی مواد فراہم کرتی ہے اور اسے باریک سے باریک نظر سے دیکھنے کی تلقین کرتی ہے گویا اللہ کی دانش پرور کتاب یہ خواہش رکھتی ہے کہ اس سے کسب فیض کرنے والا خدا مست قلندر کارگاہ حیات کی ہر چیز میں اپنے بنانے والے معبود کی نورانی جھلک دیکھنے کی سعی کرے اور اس طرح وہ تلاش حق میں اتنا مست ہو جائے کہ اس کی نگاہیں ہر سو ہمہ اوست کے جلوے دیکھنے لگ جائیں۔

لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾ ۙ

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۳۸﴾

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿۳۹﴾

تاکہ وہ کھائیں اس کے پھلوں میں سے جو ان کے اپنے ہاتھوں کے ساختہ پرداختہ نہیں، پھر کیا ہے کہ وہ شکر کی روش اختیار نہیں کرتے (۳۵)

بہت طاقت والی ہے وہ ذات جس نے پیدا کئے جوڑے ہر چیز سے ان سے بھی جنہیں اُگاتی ہے زمین اور خود ان سے بھی اور ان چیزوں سے بھی جنہیں یہ جانتے تک نہیں (۳۶)

اور ان کے لئے ایک عظیم نشانی رات ہے، کھینچ لیتے ہیں ہم اس کے اُوپر سے دن کو تو اچانک وہ اندھیروں میں رہ جاتے ہیں (۳۷)

اور سورج چلتا رہتا ہے اپنے مدار میں مقررہ مدت کیلئے، یہ منصوبہ بندی ہے زبردست قدرت والے علیم کی (۳۸)

اور چاند کی مقرر کردی ہیں ہم نے منزلیں یہاں تک کہ لوٹ آتا ہے وہ جیسے کھجور کی بوسیدہ پرانی شاخ ہو (۳۹)

مفردات

لِيَاْكُلُوْا: تاکہ وہ کھائیں

مِنْ ثَمَرِهٖ: اس کے پھلوں سے اصل میں ثمر ھا ہونا چاہئے تھا، لیکن عبارت تفسیری میں مذکور کو مرجع قرار دے دیا گیا ہے

"ثمرہ" میں جمہور نے "ث" اور "م" دونوں کے فتحہ سے پڑھا ہے اور حمزہ کسائی وغیرہ نے دونوں کے ضمہ سے پڑھا ہے

وَمَا: اور جو یا اور نہیں

جائز ہے کہ یہاں "ما" کو موصولہ پڑھا جائے اور یہ بھی کہ اسے نافیہ بنا کر پڑھا جائے

عَمِلَتْهُ: بنایا اسے

اَيْدِيْهِمْ: اس کے ہاتھوں نے

اَفَلَا: کیا وہ نہیں

يَشْكُرُوْنَ: شکر کرتے

لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

"تاکہ کھائیں اس کے پھلوں میں سے جو ان کے اپنے ہاتھوں کے ساختہ پرداختہ نہیں۔ پھر کیا ہے؟ کہ وہ شکر کی روش اختیار نہیں کرتے"۔

لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ

امام رازی نے "ثمرہ" میں مرجع ضمیر پر گفتگو کرتے ہوئے تین احتمال نقل کئے ہیں:

ایک یہ کہ "ہ" ضمیر کا مرجع خود اللہ کی ذات ہے۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ "کھائیں اللہ کے دیئے گئے پھل"۔ انسانی غذاؤں کا یہ قدرتی اور فطرتی بندوبست بذات خود اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ درختوں کی شاخوں پر لگے ہوئے پھل اتنے کامل اور مکمل ہوتے ہیں کہ پکانے کی زحمت بھی نہیں اٹھانا پڑتی۔ وہ ایسے حسین لبادوں اور خولوں میں بند کر دیئے جاتے ہیں کہ کتنی کتنی مدت تک خراب ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہاں "ہ" ضمیر کا مرجع نخیل ہے۔ کھجوروں کے لانبے لانبے حسین اور جمال افروز درخت ہی اللہ کی نشانیوں میں سے نہیں بلکہ ان کے ساتھ لگنے والا پھل بھی اپنی لذت میں بے مثال اور اپنے فائدوں میں حیرت انگیز ہے۔ وہ اپنے گابھے میں ہو یا ذخیرہ بن کر انسانی ہاتھوں میں پہنچ جائے، نقاش فطرت کی کاریگریوں اور حکمت مآبیوں کی منہ بولتی تصویر ہے۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ "ہ" ضمیر کا مرجع "تفجیرا" ہو۔ ہمارے خیال میں مضبوط موقف یہی ہو سکتا ہے اور اس سے سیاق وسباق کے حوالہ سے چشموں کی فیض رسانیوں کی طرف اشارہ ہے اور اگر بقول بعض مفسرین کے فوائد اعمال مراد لے لئے جائیں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں جیسے عبادت میں ثواب اور تجارت میں نفع ہوتا ہے۔

وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ

اس حصہ میں "ما" نافیہ بھی ہو سکتا ہے اور موصولہ بھی۔ اگر نافیہ ہو تو مفہوم یہ ہوگا کہ یہ ابلتے چشمے، بہتے دریا، گل پوش وادیاں، دلفریب مناظر، جاذب نظر زمین، روح پرور باغات، حسن افروز بیلیں اور جمال آسا درخت انسان کی تخلیق نہیں بلکہ معمار حقیقی کی عطا ہیں۔ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے کہ انسان پھول کی ایک پتی بنانے پر بھی قادر نہیں تو انسانوں کی یہ بے چارگی بذات خود کسی خلاق مطلق کی معرفت کی روشن دلیل ہے۔ دوسری صورت میں "مـــا" موصولہ ہوگا اور اس صورت میں جملہ کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ کی تخلیقی سلسلے جہاں اس کی توحید و وجود کے گواہ ہیں وہاں جو کچھ انسان اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے وہ

بھی کسی عظیم وجلیل معلم کی سپاس گذاری کے جذبے پیدا کرتا ہے۔ایسے ہی موقعوں پر اقبال تڑپ تڑپ کراور مچل مچل کر اپنے قلندرانہ خیالات کا اظہار یوں فرماتے ہیں:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ

تعجب ہے ان انسانوں پر جو زمین پر چلتے ہیں لیکن اس کے پیدا کرنے والے کی طرف دھیان نہیں دیتے، سایہ دار درختوں کے ٹھنڈے سایوں سے سکون حاصل کرتے ہیں لیکن انہیں بنانے والے خالق سے محبت نہیں رکھتے، ابلتے چشموں سے رواں ہونے والے میٹھے پانی سے لذت کام ہوتے ہیں لیکن انہیں جاری کرنے والے رب کی معرفت حاصل نہیں کرتے، رسیلے پھلوں، میٹھی کھجوروں، شیر بھرے انگوروں سے لطف مند ہوتے ہیں لیکن یہ نعمتیں دینے والے منعم کا شکر ادا نہیں کرتے۔ جہان رنگ و بو میں بہت کچھ بنتا بگڑتا دیکھتے ہیں اور ہمہ دم عجیب عجیب انقلابات کا جائزہ لیتے ہیں لیکن یہ یقین نہیں رکھتے کہ زندہ خدا مردہ انسانوں کو پھر سے زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔آیات کائنات کیا ان کی نظر نہیں کھولتیں؟ اور کیا وہ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی آمادہ نہیں ہوتے کہ اپنے منعم کے سامنے شکر کی روش اختیار کریں۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٦﴾

”بہت طاقت والی ہے وہ ذات جس نے پیدا کئے جوڑے ہر چیز سے ان سے بھی جنہیں اگاتی ہے زمین، خود ان سے بھی اور چیزوں سے بھی جنہیں یہ جانتے تک نہیں“۔

یہ صرف زمین ہی نہیں جسے دیکھنے والی آنکھ کے لئے رب کریم نے آغوش حسن بنا دیا بلاشبہ اس پر بچھے ہوئے سبزوں کے مخملیں فرش، عطر بیز ہوائیں، نظر افروز نظارے اور جنت نگاہ مساکن رب قدیر کے وجود وعطا پر خوبصورت اور یقین پرور دلیلیں ہیں لیکن غور وفکر کی ریاضت سے آشنا دلوں کے لئے اس میں مختلف نسلوں کی افزائش کے ایمان پرور سلسلے بھی عقل وخرد کی ہدایت کا صد سامان فراہم کرتے ہیں۔

مفردات

سُبْحٰنَ: پاک ہے وہ
یہاں تنزیہ باری کے لیے ہے بعض مقامات پر اس کا معنٰی ”قوت والا“ سے بھی کیا جائے گا

الَّذِيْ: وہ ذات۔اسم موصول

خَلَقَ: پیدا کیا

الْاَزْوَاجَ: جوڑے
ازواج زوج کی جمع ہے اور اس کا اطلاق حیوانات میں سے مؤنث اور مذکر پر ہوتا ہے اور کبھی اس کا اطلاق معنوی اعتبار سے مختلف چیزوں کی ہم آہنگی کی بنیاد پر کر دیا جاتا ہے

كُلَّهَا: سب

مِمَّا: اُن میں سے جو

تُنْۢبِتُ: اُگاتی ہے

الْاَرْضُ: زمین

وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ: اور اس کی جانوں میں سے بھی

وَمِمَّا: اور وہ جو

لَا: نہیں

يَعْلَمُوْنَ: وہ جانتے

مفردات

انسانوں کے اپنے وجود سے لے کر نباتات تک، گل بوٹوں سے لے کر حیوانات تک یہاں تک کہ ہوائی لہروں سے لے کر حرارت تک، برق و بجلی کی رووں سے لے کر جمادات تک، کوئی بھی شے زوج یعنی جوڑا ہونے کے تصور سے خالی نہیں۔ مرد کی فتوت کب مکمل ہوا گر عورت کے خمار نظر اور پیکر رعنا کا وجود نہ ہو اور عورت کا حسن بے معنی ہو جائے اگر مرد کا دل نواز شیوہ موجود نہ ہو۔ راتوں کی زلف میں سیاہیاں نہ ہوں تو دنوں کے نور کی حقیقت کون جانے اور دنوں کے چہرے پر غازۂ نور نہ ہو تو شب تار کی تیرگیوں کا تعارف کیونکر ممکن ہو، نر مادہ کے کون آفرین تصورات نہ ہوں تو انسانی قافلوں کی خدمت کے لئے حیوانات کیسے پیدا ہوں۔ مثبت اور منفی برقی روئی اپنا وجود کھو بیٹھیں تو شاید یہ خوبصورت جہاں بھی ظلمت کدہ بن جائے۔ بلاشبہ وہ ذات بڑی قوت والی ہے جس نے یہ سلسلے تخلیق کئے اور وہ اکیلی ہی وہ ہستی ہے جس نے نیست کو ہست کا یہ نور عطا کیا یقیناً وہ ذات کبریا ان باتوں سے پاک بھی ہے جو نادان انسان اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ سبحان کہہ کر گویا ربِ حُسن یہ کہہ رہا ہے کہ

حُسن کے پرستارو سچ بتاؤ!

رب سے کوئی زیادہ حسین ہو سکتا ہے۔۔۔ سبحان اللہ!

رب سے بڑھ کر کوئی طاقت والا ہو سکتا ہے۔۔۔ سبحان اللہ!

رب سے کوئی زیادہ پاک ہو سکتا ہے۔۔۔ سبحان اللہ!

نور و حرکت اسی سے ہے

حسن و زندگی کا خالق وہی ہے

کائنات میں تنوع اور تغیر کے رنگ وہی بھرتا ہے

موجودات کی افزائش میں اسی کا حسن ارادہ شامل ہوتا ہے

دلوں کی خوراک نشاط و انبساط اسی کی عطا سے ملتی ہے

پس مان لو!

مان لو!

مصطفٰے کریم ﷺ کا رب تمہیں اپنی طرف بلا رہا ہے

اللھم صلی علی سیدنا محمد و علیٰ ال سیدنا محمد کما تحب و ترضی

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾

”اور ایک عظیم نشانی ان کے لئے رات ہے، کھینچ لیتے ہیں ہم اس کے اوپر سے دن کو تو اچانک وہ اندھیروں میں رہ جاتے ہیں“۔

وَ: اور

اٰيَةٌ لَّهُمُ: نشانی ان کے لیے

الَّيْلُ: رات

نَسْلَخُ: ”سلخ“ سے اس کا معنٰی جانور کی کھال اتارنا ہوتا ہے اور اخراج کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے

مِنْهُ: اس سے

النَّهَارَ: دن

فَاِذَا هُمْ: تو اچانک وہ

مُّظْلِمُوْنَ: اندھیرے میں رہ جاتے ہیں

اس آیۂ کریمہ میں غور طلب بات یہ ہے کہ خالق ارض وسما نے رات اور دن، روشنی اور تاریکی، روز وشب اور لیل ونہار کو بطور نشانی بیان فرمایا ہے، "نسلخ منه النهار" (کھینچ لیتے ہیں ہم اس کے اوپر سے دن کو) تدبر کا تقاضا کرتا ہے اس فقرہ میں دو چیزیں لائق توجہ ہیں:

ایک رات اور دن کا نظام اور اس کے انقلابی پہلو، دوسری زمین اور اس کی اصلی حالت اور خارج سے روشنیوں کا اہتمام۔

مولائے کائنات نے صدق چینی اور نور گیری کے لئے قاریٔ کتاب کے سامنے دنوں اور راتوں کی نظم آفرین بے تابیاں رکھ دیں۔ دیکھتے نہیں کہ روشنیوں کے خدامست قافلے کس طرح اندھیریوں کو دھکیل کر کارگاہ حیات کو بقعۂ نور بنا دیتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے راتوں کی دبیز سیاہیاں سینوں پر ستاروں کا حسن سجا کر مانگوں میں ماہتاب کے زر پارے بھر کر کس طرح ان کے اُجالوں کو الوداع کہہ دیتی ہیں۔ کیا یہ فطرت کا اندھا عمل ہے؟ اس کے پیچھے کسی مدبر کی تدبیر شامل نہیں، کیا اتنے بڑے انقلابات بغیر کسی منصوبہ بندی کے وقوع پذیر ہو رہے ہیں؟ نہیں! نہیں! رات کے رود رواندھیرے، دنوں کی موج در موج روشنیاں، ہمیں بتاتی ہیں کہ نظام کائنات الل ٹپ نہیں بلکہ اس کے چلانے والا کوئی قادر الہٰ بھی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ بزم کائنات کی یہ شوخ شوخ ادائیں کسی قادر خدا کے موجود ہونے کی دلیل ہیں بلکہ اس میں واقع ہونے والی نشیب وفراز اور ہمہ دم سیماب نظر انقلابات کی برق رفتار حرکتیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ جس طرح روشنیوں کا تعاقب اندھیرے کر رہے ہیں، دنوں کا پیچھا راتیں کر رہی ہیں۔ اسی طرح زندگی کے لشکر کو موت پیچھے دھکیل رہی ہے اور یہ بھی کہ اگر رات کو دن اور دن کو رات بنایا جا سکتا ہے تو پھر موت کے بعد بے جان پیکروں کو دوبارہ زندگی کی روحیں عطا کی جا سکتی ہیں۔ "نسلخ" کا معنی آئمہ تفسیر نے "جانور کی کھال کھینچنا لکھا ہے" (86)۔ قرآن حکیم نے اصلاح و ہدایت کے لئے ایک لطیف اور جامع تعبیر استعمال کی ہے گویا دنوں کے اُجالے خوبصورت نورانی لباس ہوتے ہیں جو طلوع آفتاب پر راتوں کو پہنا دیئے جاتے ہیں اور جب سورج غروب ہوتا ہے تو یہ لطیف اور نوری لباس اتار لئے جاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں قرآن حکیم نے یہاں رات اور دن کو "نور دعوت" کے لئے بطور کنایہ استعمال کیا ہے گویا انبیاء کی بعثت، نزول وحی اور تعلیم کتاب وہ روشنی کے لباس ہوتے ہیں جو اللہ رب العزت کسی قوم پر مہربان ہو جائے تو انہیں بطور انعام عطا فرماتا ہے پھر ایک وقت تک اس نور کے لباس میں اس قوم کی بے اعتدالیاں پوشیدہ ہو جاتی ہیں لیکن جب وہ قوم اس خلعت نور و رحمت کی قدر نہیں کرتی تو جس طرح اللہ دن کی چادر ہٹا تا ہے تو رات بچ جاتی ہے۔ وہ ناقدر اور بے قدر قوم بھی اندھیروں میں ڈوب جاتی ہے اللہ کریم نورانی قیادتیں اور روشن ہدائتیں کسی دوسری قوم کو عطا کر

دیتا ہے یہاں یہ بات اچھی طرح پلے باندھ لی جائے کہ جس طرح رات اور دن کسی کو بقا نہیں اسی طرح تاریخ دعوت میں بھی ترقی اور ارتقاء کے مواقع اور اتفاقات محدود ہوا کرتے ہیں، ایک بار موقع ضائع ہو جائے تو پھر برسوں گردش زمانہ سے بندھے ہوئے تقدیر بدل اور لطیف انقلابی جھونکوں کے لئے لذت کش انتظار رہنا پڑتا ہے۔

''نسلخ منه النهار'' میں حضرات مفسرین نے ایک لطیف بحث بھی چھیڑی ہے کہ کرۂ ارض کی اصلی فطرت تاریکی ہے۔ نور اور روشنی اس کی عارضی صفت ہے جو خارج سے عطا کی جاتی ہے۔ شوکانی کے الفاظ ہی'' ان الاصل هی الظلمة والنهار داخل عليه ''زمین کی اصل ظلمت ہے دن اس پر باہر سے داخل ہونے والا ہے(87)۔ سائنسی اعتبار سے اس وقت زمین پر روشنی کے بارے میں دو نظریئے ہیں: ایک یہ کہ اس کے نور کا مصدر سورج ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے اندر مقناطیسی سلاخیں (Magnatic rods) ہیں جو خود روشنی پیدا کرتی ہیں۔ کیا بعید ہے کہ زمین جب سورج کے سامنے جاتی ہو تو سورج کے نور سے زمین کی مقناطیسی سلاخیں نور دینے لگتی ہوں۔ اس سائنسی نظریئے سے ایک دینی نکتہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اسلام کے نور کی اصل بھی اللہ کی ذات ہے لیکن اس کا مظہر انبیاء کرام عموماً اور مصطفٰے کریم ﷺ خصوصاً ہیں گویا معرفت الٰہ کے لئے ضروری ہے کہ معرفت مصطفٰے صلی اللہ علیٰ نبینا الکریم حاصل ہو(88)۔

بے ان کے واسطے کے خدا کچھ عطا کرے
حاشا غلط غلط یہ ہوس بے بصر کی ہے

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۳۸﴾

''اور سورج چلتا رہتا ہے اپنے مدار میں مقررہ مدت کے لئے، یہ منصوبہ بندی ہے زبردست قدرت والے علیم کی''۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ

اس سے قبل رات اور دن کی ظلمتوں اور اُجالوں کو قرآن حکیم نے قدرت الٰہیہ کی ایک عظیم الشان نشانی قرار دیا۔ وہ ذہن جس پر جہالت اور فکری انحطاط کا غبار چھایا ہو، اس خام سوچ کا شکار ہو سکتا ہے کہ رات دن تو سورج کی حرکت سے پیدا ہوتے ہیں گویا رات اور دن میں اگر کوئی کمال ہے تو وہ بھی سورج کے ہی وجود کا مرہون منت ہے۔ رب قدیر نے ایسی نازیبا سوچوں کی اصلاح فرماتے ہوئے اس آیۂ کریمہ میں ارشاد فرمایا کہ یہ'' سورج اور آفتاب بھی قادر الہ کی قدرت سے باہر نہیں، خدا کے سامنے ان کے مسخر ہونے کی سب سے بڑی اور وقیع دلیل خود ان کا اپنا نظام حرکت و استقرار ہے''۔ قرآن مجید

مفردات

وَالشَّمْسُ: اور معطوف علی الیل بھی ہو سکتا ہے اور جملہ کا جملہ پر عطف بھی ہو سکتا ہے

تَجْرِيْ: تیز چلنا
اساسی طور پر تو کسی پاؤں والی چیز کا تیزی سے چلنا ''جـــری'' ہوتا ہے البتہ مجازاً کسی جسم کا تیزی سے متحرک ہونا بھی اس لفظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے

لِمُسْتَقَرٍّ: لام بمعنٰی ''الـــیٰ'' ہے اور مستقر ظرف زمانی ہو اور بعض کے نزدیک آسمان کا انتہائی بلندی پر عروجی نقطہ جو موسم گرما میں نقطۂ انقلاب صیفی سرطان کہلاتا ہے
لغوی معنٰی ٹھکانا ہوتا ہے

لَّهَا: اس کے لیے

ذٰلِكَ: وہ

تَقْدِيْرُ: مقرر کیا ہوا اندازہ

الْعَزِيْزِ: غلبے والا

الْعَلِيْمِ: بہت علم رکھنے والا

مفردات

میں سورج کے بارے میں دو چیزوں کا انکشاف کیا: ایک تو یہ کہ وہ متحرک ہے اور دوسرا یہ کہ وہ ایک مستقر یا ٹھہراؤ بھی رکھتا ہے۔ جہاں تک اس کی حرکت کا تعلق ہے تو یہ دو نسبتوں کی حامل ہے ایک تو زمین کے ساتھ اور دوسری اس کے کہکشانی مرکز ''وگا'' کے ساتھ۔ بقول ماہرین فلکیات سورج کی ایک سالانہ ظاہری حرکت زمین کے گرد اگرد ہے اور کہا جاتا ہے کہ رات اور دن اسی سے پیدا ہوتے ہیں اور دوسری حرکت اپنی کہکشاں سمیت ''وگا'' کے گرد اگرد ہے۔ سورج کی یہ طولی اور دورانی حرکتیں آج کے دور میں ناقابل فہم نہیں۔ ایک شخص اگر ہوائی جہاز میں بیٹھنے کے بعد آگے پیچھے حرکت کرے اور ہوائی جہاز کسی شہر کے گرد اگرد گھوم رہا ہو تو بیک وقت اس شخص کے بارے میں تین حالتیں سمجھ میں آئیں گی۔

ایک یہ کہ وہ شخص جہاز میں ٹھہرا ہے۔ اس لحاظ سے جہاز اس کا مستقر ہوگا۔

دوسرا یہ کہ وہ شخص جہاز میں آگے پیچھے حرکت کر رہا ہے اس لحاظ سے اس کی حرکت طولانی ہوگی۔

تیسرا یہ کہ وہ اپنے جہاز سمیت اپنے شہر کے گرد اگرد گھوم رہا ہے اس لحاظ سے اس کی حرکت دورانی ہوگی۔

سورج بھی ان تین حالتوں سے خالی نہیں۔ اس کا یہ زبردست نظام حرکت و استقرار، نہ صرف یہ کہ انسانی آنکھوں کو کھول دینے والا ہے بلکہ ان میں معرفت باری اور عرفان حق کا نور بھی پیدا کرنے والا ہے۔ سورج اپنی حرکت میں اگر دقیقہ بھر بھی تقدم یا تأخر کر دے تو انسانی کائنات یا سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر جائے یا گرمی سے بھن جائے۔ یہ ہے وہ نقطہ جسے قرآن حکیم اس الفاظ میں بیان کر رہا ہے:

ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ

گویا قرآن مجید ان کور بین انسانوں کی آنکھوں میں بینائی کا نور ڈال رہا ہے جو نظام کائنات کو کیمیائی اور طبیعیاتی قوتوں کا اندھا عمل قرار دیتے ہیں۔ اس میں کیا شک ہے کہ سورج وہ نورانی پردۂ لطیف ہے جس پر موجد کائنات کے وجود کا حسن دیکھا جا سکتا ہے، یہ وہ حجاب ہے جس سے وراء سرچشمۂ حقیقت کا سراغ لگا لینا مشکل نہیں رہتا، یہ وہ بے تاب مسافر ہے جس کا ہمہ دم سفر اشتیاق منت کشِ عشق ہونے کا درس دیتا ہے۔ اس کی روشن اور جاذب نظر کرنیں مقصد فطرت کو برہنہ کر کے تسکین کا سبب بنتی ہیں۔ اس کا محیر العقول وجود انسانی آنکھوں سے پستیوں کی دھول نکال کر بلندیوں کو منزل بنانے کی روشنیاں عطا کرتا ہے، یہ درویش خدامست اپنے عمل سے بتاتا ہے کہ وہ سب کائنات کو فیض یاب کر کے بھی ''کچھ نہیں'' وہ اپنے وجود و بقا میں ایک اور ہستی کا محتاج ہے اور وہ جسے الٰہ کہتے ہیں، خدا کہتے ہیں واللہ۔۔۔ اسے اللہ کہتے ہیں۔۔۔۔!!

لمستقر لها ۔۔۔۔ اپنے مدار پر مقررہ مدت کے لئے

عطا ابن ابی رباح نے اسے "لا مستقر لها" بھی پڑھا ہے(89)۔ اس صورت میں آیۂ کریمہ کا

مفہوم ہوگا کہ سورج بغیر ٹھہراؤ کے برابر چلتا رہتا ہے۔ جمہور مفسرین نے اسے "لمستقرلھا" ہی پڑھا ہے۔اس قرات کے مطابق حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سورج کا مستقر" برج الاسد" ہے(90) ۔مقاتل کے نزدیک مطلق وقت مراد ہے اور واحدی کہتے ہیں کہ مستقر سے مراد قیامت کا دن ہے یعنی جب تک وقوع قیامت نہیں ہوتا سورج اپنے مدار پر متحرک رہے گا۔ بعض آئمہ تفسیر نے "مستقر" سے مراد سورج کے طلوع وغروب کے افق بھی لئے ہیں۔ "مستقر" کا ایک مفہوم خود حضور ﷺ سے بھی منقول ہے۔حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ حضور ﷺ کے ساتھ غروب آفتاب کے موقع پر مسجد میں حاضر تھے۔آپ ﷺ نے ان سے کہا ابوذر! کیا تم جانتے ہو کہ یہ سورج کہاں غروب ہوتا ہے؟ حضرت نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی کو خوب معلوم ہے۔اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا" سورج برابر چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ عرش کے نیچے پہنچ کر سجدہ کرتا ہے"۔اور پھر آپ نے فرمایا اس آیہ میں "مستقر" سے مراد یہی ہے(91)۔ابن کثیر وغیرہم مفسرین نے اس سے ملتی جلتی کچھ اور روایات بھی نقل کی ہیں(92)۔یاد رہے کہ یہاں سجدہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی تدبیر وتسخیر ہے اور سجود شمس کو اگر حقیقی معنوں میں بھی مراد لیا جائے تو بھی محال نہیں۔ بعض حضرات مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ ہر چیز بیک وقت متعدد وجود رکھ سکتی ہے۔سورج کا ایک وجود وہ ہے جو ہمیں نظر آتا ہے اور ایک اس کا لطیف اور روحانی وجود ہے۔سورج اسی وجود کے ساتھ ہر شام اللہ کریم کے سامنے سجدہ زن ہوتا ہے(93)۔

ذٰلِكَ تَقۡدِيۡرُ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ

یہ سورج کا حجم، اس کا ہمہ دم متحرک رہنا، اس کی نور ریزیاں، اس کی فیض گستریاں، اس کا استقرار و استتار، اس کا بڑھنا اور گھٹنا، اس کا طلوع وغروب، اس کا قرب اور بعد اور اس کا جلال اور جمال، سب ایک مقرر اور معین نظام کے تحت ہے۔ایسا نظام اور ایسی تقدیر، ایسا انداز اور ایسی منصوبہ بندی اور اپنے صناع اور کاریگر کے قوی وقادر اور عالم وعلیم ہونے کی ایک زبردست دلیل ہے۔عمود آیت صرف اتنا ہی نہیں کہ الہٰ حسن وقدرت کو محض عزیز اور علیم تسلیم کرلیا جائے بلکہ تعلیمات کتاب سے بہرہ مند ہونے والے کے دل میں یہ عقیدہ بھی پختہ کرنا ہے کہ جس الہٰ کو وہ مطلوب ومقصود بنا چکا ہے وہ جہاں اپنے حسن وکاریگری میں واحد واحد ہے، یکتا وممتاز ہے وہاں وہ اپنی تخلیق شدہ مخلوقات اور تصنیع شدہ مصنوعات کی ضرورتوں سے بھی ناشناس نہیں۔وہ ہمہ بین اور ہمہ دان ہے اور کل شناس اور کل آگاہ ہے۔

اعمال میں سے کوئی عمل ایسا نہیں
افعال میں سے کوئی فعل ایسا نہیں

مفردات

کیفیات میں سے کوئی کیفیت ایسی نہیں
احوال میں سے کوئی حال ایسا نہیں
زمان میں سے کوئی لحظہ ایسا نہیں
مکاں میں سے کوئی گوشہ ایسا نہیں
تصورات میں سے کوئی تصور ایسا نہیں
افکار میں سے کوئی فکر ایسی نہیں
ارواش میں سے کوئی روش ایسی نہیں
ادوار میں سے کوئی دور ایسا نہیں
عناصر میں سے کوئی عنصر ایسا نہیں
مادوں میں سے کوئی مادہ ایسا نہیں
کروں میں سے کوئی کرہ ایسا نہیں
ملکوت، لاہوت، ماسوت، جبروت
کچھ بھی ایسا نہیں اور کوئی بھی ایسا نہیں

جسے وہ نہ جانتا ہو، جب وہ سب کچھ جانتا ہے سب کو جانتا ہے اور صرف جانتا ہی نہیں بلکہ سب پر قوی وقادر بھی ہے تو سوال یہ ہے کہ حضرت انسان کب تک اس کے دروازے سے بھگوڑا رہے گا۔ اس کے لئے سکون وراحت کی جنتیں اسی صورت میں آباد ہو سکتی ہیں اس کے لئے مسرتوں کے پھول اسی صورت میں مہک سکتے ہیں جب وہ مخلصانہ جذبوں اور محسنانہ اعمال سے اس کی دہلیز رحمت پر حاضری دیتا رہے۔

سورج کے نظام حرکت واستقرار سے ہم تنظیمی اور تحریکی نقطہ نظر سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں:

- سورج خود جلتا ہے اور دوسروں کے لئے روشنیوں کا بندوبست کرتا ہے۔ غلام رسول ﷺ بھی خود دکھ درد اور مصیبتیں جھیلتا ہے لیکن دوسروں کے لئے راحت کا ساماں مہیا کرتا ہے۔۔۔۔۔!!
- سورج کی فیضان افروزیاں کسی خاص نسل، طبقہ اور علاقہ تک محدود نہیں ہوتیں اس کا نور ہمہ گیر اور ہمہ نواز ہوتا ہے۔ غلام مصطفیٰ کریم ﷺ بھی حسن ونصب کے بتوں کو توڑ کر ہمہ گیر انقلاب کا داعی ہوتا ہے۔ اس کے وجود بے تاب سے بغیر تخصیص جمیع انسانیت فائدہ اٹھا سکتی ہے۔۔۔۔!!
- سورج اپنے نظام میں ایک ''منصوبہ بندی'' میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔ غلام مصطفیٰ کریم صل اللہ علیٰ نبینا الکریم وآلہ واصحابہ اجمعین بھی اپنے امور حیات میں غیر منظم اور درویش ندگی ناشناس نہیں ہوتا بلکہ اس کا ہر کام منظم اور مربوط ہوتا ہے۔۔۔۔!!

- سورج ایک دقیقہ کے لئے بھی اپنے مرکز سے تعلق ترک نہیں کرتا۔غلام مصطفیٰ کریم ﷺ بھی اپنے افکار اور عقیدتوں کے مرکز رسول اللہ ﷺ سے اپنا تعلق کمزور نہیں ہونے دیتا۔۔۔۔!!
- سورج سب سے پہلے اسے فیض یاب کرتا ہے جو اس کے سامنے آتا ہے۔غلام مصطفیٰ کریم ﷺ بھی اپنے کام کا آغاز اپنے گھر اور دوست احباب سے کرتا ہے۔انہیں نظر انداز کر کے ہمہ گیر فیض آرائیوں کی ضمانت مہیا نہیں کی جا سکتی۔۔۔۔۔!!
- سورج اگر ایک جگہ طلوع ہو تو دوسری جگہ غروب ہوتا ہے اور ادھر اگر طلوع ہو تو ادھر غروب ہوتا ہے۔غلام مصطفیٰ ﷺ جہاں اور جدھر چلا جائے اپنے فرض منصبی اور تحریکی ذمہ داریوں سے تغافل نہیں برتتا۔وہ ہمہ دم رگہائے حیات سے گرہ کشائیوں میں مصروف رہتا ہے۔۔۔!!

جہاں میں اہل ایمان صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے ادھر نکلے(94)

- سورج ہمہ دم متحرک ہونے کے باوجود ایک ''مستقر'' رکھتا ہے۔غلام مصطفیٰ کریم ﷺ بھی دلوں میں تسخیر کائنات کے جذبے رکھنے کے باوجود کام کرنے کے لئے کوئی خاص مستقر اور علاقہ متعین کرتا ہے تاکہ کام کی نتیجہ خیزیاں مناسب انداز میں سمیٹی جاسکیں۔۔۔۔!!
- سورج ایک وقت میں زمین سے نہایت قریب ہو جاتا ہے جسے ''حضیض'' بولتے ہیں اور دوسرے وقت میں زمین سے بہت دور ہو جاتا ہے جسے ''اوج'' کہتے ہیں۔غلام مصطفیٰ کریم ﷺ بھی کارکشایان تحریک سے حسب ضرورت کبھی قریب اور کبھی بعید ہو جاتا ہے لیکن اس کا قرب و بعد مقصدیت سے خالی نہیں ہوتا۔۔۔۔!!
- سورج کی نور نور کرنوں ہی سے گل ولالہ اگتے ہیں، فصلیں پکتی ہیں، گلابوں کو حسن ملتا ہے، کلیاں مسکراتی ہیں، سبزے محورقص ہوتے ، ہیں اور زندگی رونق حاصل کرتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایک بڑی ذات کے سامنے سجدہ زن ہوتا ہے۔غلام مصطفیٰ کریم ﷺ بھی اپنی فیض آفرینیوں میں در نایاب ہونے کے باوجود متواضع اور منکسر المزاج ہوتا ہے اور اگر کبھی وہ جلال کا شکار ہو بھی جائے تو اس کے پیش نظر مقصد اور مشن کی اہمیت ہوتی ہے۔۔۔۔۔!!

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق وباطل ہو تو فولاد ہے مومن(95)

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿۳۹﴾

''اور چاند کی مقرر کر دی ہیں ہم نے منزلیں یہاں تک کہ لوٹ آتا ہے وہ جیسے کھجور کی بوسیدہ پرانی شاخ ہو''۔

آفتاب کی گرمیوں اور اس کی دھوپ میں پوشیدہ اثرات کو جب قرآن حکمت آموز پیرائے میں بیان کر چکا تو اس نے اپنے قاری کی توجہ چاند کی طرف پھیر دی۔ چاند اور اس کے وجود میں، چاندنی اور اس کی مٹھاس میں، مہتاب اور اس کے جمالیاتی سفر میں دیکھنے والوں کے لئے ان گنت ایسی دلیلیں موجود ہیں جن سے خدا کے قادر ہونے پر یقین پیدا کیا جا سکتا ہے۔ چاند کا بڑھنا اور گھٹنا، ہلال ہونا اور بدر بننا، ظاہر ہونا اور غروب ہو جانا صاف طور پر بتاتے ہیں کہ اس کی سب منفعتیں کسی قادر الٰہ کے دست قدرت میں ہیں، وہ جیسے چاہتا ہے اسے حرکت دیتا ہے اور جیسے چاہتا ہے اسے غروب کر لیتا ہے۔ رات کے وقت چاند کے حسن کا ایک نظارہ آسمان پر اور ایک نظارہ زمین پر دیکھا جا سکتا ہے، فلک پیر کی آغوش میں جب اپنی منزلوں پر یہ رقصاں ہو تو جذبات اور خیالات میں ایک تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس کی حسن آرائیوں کی روح گیر اداؤں میں خدائی توحید کے جلوے نظر آنے لگتے ہیں اور جب اس کی چاندنی شب تار کا کلیجہ چیر کر کسی باغ میں پھول کی پتیوں کے چہرہ پر حسن کا غازہ مل رہی ہو یا پھر کسی دریا کی موجوں میں جذب ہو رہی ہو تو بھی تنہائیوں کے اس نورانی ماحول میں نادیدہ معبود کے سامنے اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ فکر انسانی کے پاس سوائے اپنی بے بسی کے کچھ بھی نہیں بچتا، پھر چاند کا خالق اپنے حسن سے دیکھنے والے کو ایسا گھائل کر دیتا ہے کہ اس کی روح مستانہ وار تلاوت میں مشغول ہو جاتی ہے۔

''والقمر قدرنه منازل'' کے الفاظ میں وہ جوش ہے کہ انسانی شعور خود بیدار ہو کر گویا چاند کے ساتھ متحرک ہو جاتا ہے اور جس طرح چاند اپنی منزلوں کو کبھی فراموش نہیں کرتا، اسی طرح انسانی شعور اور جذبات نبیوں اور رسولوں کی امامت کے بغیر کہیں قناعت نہیں کرتے اور جیسے چاند کی آخری منزل ڈوب جانا ہے انسانی شعور کی آخری منزل بھی حضور ﷺ کی ذات میں گم ہو جانا ہے۔

چاند کی آخری حالت کو ''العرجون القدیم'' سے تشبیہ دینا کتاب اللہ کا ایک اعجاز ہے۔ عرجون کا مادہ ''العراج'' ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ''عرج'' سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد کھجور کے گوشے کا وہ حصہ ہوتا ہے جو درخت سے ملا ہوتا ہے، اس طرح کے کھجوریں گوشوں کی صورت میں جب درخت پر ظاہر ہوتی ہیں اس کا نچلا حصہ کمان کی شکل میں ہوتا ہے جو درخت سے ملا ہوتا ہے اور کھجوریں اس کے ساتھ متصل پیوستہ ہوتی ہیں۔ کھجور کا گوشہ کا ٹو تو درخت پر کمان کی شکل میں خوشوں

مفردات

وَالْقَمَرَ: اور چاند
نافع، ابن کثیر، ابو عمرو وغیرھم نے اسے مرفوع پڑھا ہے اور دیگر قرأ نے منصوب پڑھا ہے۔ نحوی نقطۂ نظر سے ''والشمس تجری'' پر یہ معطوف ہے اور مبتداء بھی ہو سکتا ہے

قَدَّرْنٰهُ: اندازہ مقرر کیا ہم نے اس کا
جملہ ''قدرنہ'' حال بھی بن سکتا ہے اور خبر بھی

مَنَازِلَ: منزلیں

حَتّٰى: یہاں تک کہ

عَادَ: لوٹا

كَالْعُرْجُوْنِ: کھجور کی شاخ ایسی جس کی انتہا پر پھل لگا ہوتا ہے

الْقَدِيْمِ: پرانی

کا نچلا حصہ بچ جاتا ہے۔ جب وہ خشک ہو جائے تو بالکل اس کی شکل اور چاند جب آخری رات کم رنگ اور کمزور ہو جائے تو اس کی شکل ایک لگتی ہے۔ گویا چاند کی پہلی حالت انسان کی پیدائش پر دلالت کرتی ہے اور اس کا چودھویں رات ماہ کامل بن جانا شباب کے ہنگاموں کا غماز ہوتا ہے اور آخری منزل میں چاند کا تھکا تھکا سا ہونا ضعیف اور کمزور ہونا اور کم رنگ اور بے نور ہونا، بڑھاپے اور فنا کی تاریکیوں کا تصور پیدا کرتا ہے۔ گویا چاند کے چہرے سے دنیا کی فنا و بقا کی تاریخ پڑھی جا سکتی ہے اور ہر شخص یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس کی زندگی کا سفر کس سمت جاری ہے اور یہ سلسلہ کہاں جا کر ٹوٹ جائے گا۔ بات صرف سمجھنے کی ہے۔

سیل زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر تھی
تخت و کلاہ و قصر کے سب سلسلے گئے
آنکھوں کو چھیدتے ہوئے نیزوں کے سامنے
محراب زر سے اٹھتے ہوئے قہقہے گئے
ہر سانس لیتی کھال کھنچی لاش کے لئے
شہنائیوں سے جھڑتے ہوئے زمزمے گئے
دامن تھے جن کے خون کے چھینٹوں سے گلستاں
وہ اطلس و حریر کے پیکر گئے گئے(96)

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَ
كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾
وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾
وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾
وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿۴۳﴾
اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۴۴﴾

نہیں سورج کی یہ پہنچ کہ پکڑے چاند کو اور نہ ایسے کہ رات دن پر سبقت لے جائے اور ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے (۴۰)

ایک بڑی نشانی ان کے لئے یہ ہے کہ اٹھایا ہم نے ان کی اولاد کو ایک بھری کشتی میں (۴۱)

اور پیدا کیں ہم نے ان کے لئے اس (کشتی) کی مانند وہ چیزیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں (۴۲)

اور ہم چاہیں تو ڈبو ماریں انہیں پس ان کی آواز تک کوئی نہ سنے اور (ایسے کہ) نہ وہ بچائے جائیں (۴۳)

بجز اس کے کہ ہماری طرف سے ایک رحمت ہے اور ایک وقت تک فائدہ پہنچے ہے (۴۴)

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝٤٠

''نہیں سورج کی یہ پہنچ کہ وہ پکڑے چاند کو اور نہ ایسے کہ رات دن پر سبقت لے جائے اور ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے''۔

دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والے دماغ کے لئے ان کی ساخت اور نظام میں عرفان حق اور ایقان حقیقت کی اطمینان بخش روشنیاں جگمگا رہی ہیں۔ نور رکھنے کے لحاظ سے سورج اور چاند میں کوئی فرق نہیں لیکن ساخت، حقیقت، مقصد، حرکت اور اثر کے لحاظ سے دونوں میں حیرت انگیز فاصلے موجود ہیں۔ رب کائنات نے ان کے اتحاد و اختلاف، قرب و بعد اور جمود و حرکت کے تناظر میں آگاہی اور شعور کی رحمتیں ارزاں کرنے کے لئے قرآن پڑھنے والے کی توجہ آسمانوں کے اس زبردست اور محیر العقول نظام کی طرف کھینچ لی اور فرمایا:

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ

آیۂ کریمہ حرف نفی ''لا'' سے شروع ہو رہی ہے۔۔۔ابن عاشور لکھتے ہیں کہ اس طرز کا کلام کسی حقیقت کو ذہن میں پوری طرح مستقر کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے(97) گویا رسوخ کے ساتھ سورج کے بارے میں جس حقیقت کا اظہار مقصود ہے وہ اس عقیدہ کی پختگی ہے کہ سورج بایں ہمہ پیکر نور ہے مگر وہ دست الٰہی میں مسخر ہے اس کے اپنے اختیار میں کچھ نہیں اس سے وہی کچھ ممکن العمل ہوتا ہے جس کا ارادہ اس کا خالق کرے(98) ''لا'' کے بعد یہ جملہ'' سورج کے بس میں نہیں کہ وہ چاند کو جا پکڑے''مفسرین کے ہاں تین معانی رکھتا ہے(99):

- پہلا معنی اور تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ان کے نزدیک اس فقرہ کا مفہوم تفسیری یہ ہے کہ'' باوجود اس کے کہ سورج اور چاند آسمان ہی میں ہیں لیکن ان کی منزلیں مختلف اور جدا جدا ہیں۔ نہ سورج کی مجال کہ وہ چاند کے دائرہ میں داخل ہو اور نہ چاند کے بس میں کہ وہ سورج کے مدار میں جا گھسے، ہر ایک پوری طرح اپنے پیدا کرنے والے کی گرفت میں ہے''۔
- دوسری تفسیر مجاہد کی ہے آپ فرماتے ہیں کہ'' سورج کا چاند کے ادراک میں نہ آنے کا یا چاند کا سورج کے ادراک میں نہ آنے کا مفہوم یہ ہے کہ سورج میں یہ قوت کب کہ وہ نور ماہ کو پالے اور چاند میں یہ طاقت کدھر کہ سورج کی تابانیوں کے مشابہ ہو جائے، دونوں روشنیاں ہونے کے باوجود متغائر ہیں آپس میں ملتی نہیں''۔

مفردات

لَا الشَّمْسُ: نہیں سورج
''لا'' نافیہ '' الشمس'' مبتدا مرفوع
يَنْۢبَغِيْ: لائق ہے اسے فعل مضارع مرفوع
لَهَآ: اس کے لیے
اَنْ: یہ کہ، حرف ناصبہ
تُدْرِكَ: پالے، فعل مضارع منصوب
الْقَمَرَ: چاند
مفعول بہ منصوب، للفعل ''تدرك''
وَلَا: اور نہیں، حرف عطف اور لا نافیہ
الَّيْلُ: رات
سَابِقُ: سبقت کرنے والی۔ خبر مرفوع
النَّهَارِ: دن۔ مضاف الیہ مجرور
وَكُلٌّ: حرف عطف اور کل مبتدا مرفوع
فِيْ فَلَكٍ: مدار میں، جار مجرور متعلق ''یسبحون''
يَّسْبَحُوْنَ: تیرتے ہیں
فعل مضارع مرفوع صیغہ جمع مذکر غائب

مفردات

- تیسری تشریح قتادہ کی ہے آپ کے نزدیک ''اس میں نسخ کا مفہوم سمویا گیا ہے یعنی ایک روشنی آتی ہے تو دوسری رخصت ہوجاتی ہے اور دوسری آتی ہے تو پہلی رخصت ہوجاتی ہے، اگر دونوں میں اتصال ہوجاتا تو دن اور رات کی تمام نعمتوں سے انسان محروم ہوجاتا۔

سورج اور چاند کا اس انداز میں سرافگندہ رہنا اور شوق اطاعت میں سرشار رہنا شرک کے تمام قرینوں کو ختم کر دیتا ہے اور خدا کے قادر و مالک ہونے، واحد و یکتا ہونے اور متصرف ورب ہونے کی دلیل بن کر معرفت کا نور بانٹنے لگ جاتا ہے''۔

قرآن مجید کی سحر طرازی اور مطالب آفرینی کا یہ اعجاز ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی مثالوں میں کھلے کھلے مفہوم سمو لیتا ہے وہ اپنے انداز بحث میں انسانی ذہنوں کی طرف فکر اور شعور کے ایسے دریچے کھول دیتا ہے کہ جن سے زندگی کا نور بادسحر گاہی کی لطافتیں بانٹنے لگ جاتا ہے۔متذکرہ آیۂ کریمہ میں بھی سورج اور چاند دو خوبصورت استعارے ہیں، ان کے باہمی تعلق سے بہت کچھ سمجھا اور جانا جاسکتا ہے۔ شب وروز میں دکھائی دینے والی بہت سی چیزیں اور بھی ہوسکتی ہیں لیکن شب کی سیاہ زلفوں میں ماہتاب ڈھونڈنا اور دن کے پھول بدن سے سورج کی خوشبو تلاش کرنا انسان کی قرآنی تربیت کے بہترین اور بے نظیر نفسیاتی اصول ہیں۔ایک اچھا شخص وہی ہوتا ہے اور ایک پسندیدہ ذہن وہی ہوسکتا ہے جو نور اور روشنیوں کا متلاشی ہو۔تاریکیوں کے عاشق مچھر ہوتے ہیں اور ان کے دم قدم سے زحمتیں اور اذیتیں ہی پھوٹتی ہیں۔

سورج اور چاند کے باہمی تقابل سے یہ جاننا بھی دشوار نہیں رہتا کہ چاند کی رفتار اگرچہ تیز ہے اور سورج اپنے چلنے میں بطئی ہے لیکن اس کے باوجود دونوں اپنے اپنے مدار میں یکساں نافع ہیں گویا دونوں ایک ہی مقصد کو قوت دے رہے ہیں۔''تحریک حق'' کے کارکنوں کی صلاحیتوں میں بھی تفاوت ہوتا ہے کوئی تیز کوئی سست، کوئی نرم اور کوئی گرم، بس کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ہر شخص اجتماعی جدوجہد کی منزل یکساں اور ٹھیک رکھے اور کوشش کرے کہ وہ اپنے مدار میں نافع زندگی گزارے اور جس طرح سورج چاند کی جگہ نہیں لیتا اور چاند سورج کی جگہ نہیں لیتا، پس تقسیم کار کے قرآنی اصولوں سے فائدہ اٹھایا جائے اور ہر شخص اپنی ذمہ داری نبھانے کی کوشش کرے۔

کیا بعید ہے کہ صحرائے عرب کے ریگ مکینوں کی فطرت کے وسیع آفاق پر سورج اور چاند کی تصویریں بتا کر سمجھایا جارہا ہو کہ قدرت نے ہر چیز کی منفعتیں کسی خاص زمانہ کے ساتھ باندھ رکھی ہیں ہر شے ''کن'' اور ''عمل'' کے حوالہ سے کسی خاص وقت ہی کی مرہون منت ہے۔ایک وقت تھا رسول اپنے اپنے دائرہ کار میں دعوت حق کی روشنیاں بانٹتے تھے اب وہ وقت گزر چکا اور حضور ﷺ منصۂ شہود پر جلوہ گر

ہو گئے، اب انہی سے نور مانگنا ہوگا، اب انہی کے وجود سے پھوٹنے والی کرنیں تاریکیوں کے طوفانوں کو پیچھے دھکیلیں گی، اب ان ہی کی نظر وکرم سے خیر اور بر، نیکی اور حسنات کے گل ولالہ اگیں گے، اب اس سراج منیر، ماہ درخشاں اور نور تاباں کے سامنے جو بھی شبنم گریاں کی طرح گریزاں ہوگا، وہ اپنے بخت کا دشمن خود ہوگا، وہ اپنے نامہ اعمال میں سیاہیاں خود بھرے گا اور وہ خود ہی شعور کے کہکشانی مرکز سے گر کر جنوں کے دوزخ میں جلنے لگ جائے گا۔

کیا خوب کہا کیفی مرحوم نے:(100)

ہر دور میں جدید تقاضوں کے ساتھ ساتھ
ہوتی ہے آشکار صداقت حضور ﷺ کی
قرباں ہم اس پہ وہ ہمیں محبوب کیوں نہ ہو ؟
ایمان ہے خدا پہ امانت حضور ﷺ کی
گل کی مہک، صبا کی روش ،چاندنی کی رو
یہ سب کے سب ہیں گرد لطافت حضور ﷺ کی

وَلَا الَّیۡلُ سَابِقُ النَّہَارِ

اس فقرہ کا مفہوم تفسیری پہلے جملہ سے ملتا جلتا ہے۔ بات اگر چہ اس میں اتنی بیان کی گئی کہ رات اور دن ایک مضبوط نظام میں جکڑے ہوئے ہیں(101) نہ تو یہ ہے کہ دن کی روشنیاں رات کو جا نمودار ہوں اور نہ ہی ایسے کہ رات کی تاریکیاں دن میں آ موجود ہوں، ہر ایک کا ایک دائرہ کار ہے، ہر ایک کے عمل کا ایک مرکز ہے، ہر ایک کی اپنی ایک رفتار ہے لیکن عمل کا دائرہ، سفر کی اپنی منزل اور رفتار کا اپنا انداز رکھنے کے باوجود کسی ایک ذات کی غلامی کا نظم وضبط ان میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ مفہوم کی ان وسعتوں پر مستزاد قرآن مجید کے اس حصہ میں بلاغت کا جو سیل رواں ہے اس کا اندازہ بحر علم کے کنارے کھڑا ہو کر نہیں لگایا جا سکتا۔ قرآن مجید نے جہاں سورج اور چاند کا ذکر کیا وہاں ''ادراک'' لفظ استعمال کیا اور جہاں رات اور دن کا لفظ استعمال کیا وہاں ''سابق'' کا نظم لا کر معنوی اور صوری حسن کشی کی انتہا کر دی۔ اگر دو چیزیں آپس میں کچھ فاصلے پر ہوں تو ان کے باہمی تقابل میں اگر ہم یہ کہنا چاہیں کہ وہ ایک دوسرے کو پا نہیں سکتے تو اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے ادراک ہی موزوں لفظ ہوگا لیکن اس کے برعکس اگر دو چیزیں بالکل ملی ہوں اور دونوں کسی ایک منزل کی طرف بڑھ رہی ہوں تو لگتا ہے کہ ان میں دوڑ لگی ہوئی ہے، ایسے موقع پر ''سبقت'' کا لفظ ہی موزوں معنویت ہی پیدا کرے گا۔ اب دیکھئے کہ سورج اور چاند جن کا مدار اپنا اپنا ہے اور کروڑوں کلومیٹرز کا فاصلہ ہے، قرآن مجید نے ان کے لئے

مفردات

''ادراک'' کا لفظ استعمال کیا اور رات دن باوجود یکہ ساخت اور غرض کے لحاظ سے ان میں زمین اور آسمان کا فرق ہے لیکن یہ دونوں آپس میں ملے ہوئے بھی ہیں جیسے پھول کی پتیاں اُوپر نیچے جڑی ہوتی ہیں، یہ بھی آپس میں پیوستہ رہتے ہیں اور ان کا لمحاتی سلسلہ متحرک بھی رہتا ہے، لگتا یہی ہے جیسے ان کی آپس میں دوڑ لگی ہو لیکن کیا مجال کہ یہ اپنی اپنی جگہ سے سرک جائیں۔ کتاب معجزہ کا یہی فنی اعجاز اور ادبی جمال انسانی ذہنوں میں اتر کر ایک زبردست فکری اور شعوری انقلاب کا ذریعہ بن جاتا ہے، وہ لوگ جو ادبی ذوق رکھتے ہوں انہیں چاہیئے کہ وہ اس آیہ کریمہ کو ذرا اس ترتیب سے تلاوت کریں۔

لَا الشَّمْسُ
يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ
وَ
لَا الَّيْلُ
سَابِقُ النَّهَارِ
وَ
كُلٌّ
فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ

ان الفاظ اور جملوں میں جو نغمگی اور موسیقیت کا جو تلاطم موجود ہے گویا وہ آہستہ آہستہ انسانی شعور کو ایک خاص نورانی اور جمالیاتی ماحول میں لے جا کر سورج چاند اور رات دن کے ساتھ آفاق میں متحرک کر دیتا ہے اور شعور کی یہی سیلانی حرکت آب وگل میں جکڑے ہوئے انسانوں کو لاہوتی منزلوں کا سیار بنا دیتی ہے۔ درحقیقت یہ انسانی زندگی کی معراج ہے جو قرآن کا مقصود اصلی ہے۔

وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ

''سبح'' کی لغت میں ابن منظور وغیرہ آئمہ لغت نے لکھا کہ اس کا بنیادی معنی قوت اور طاقت ہوتا ہے(102)۔ تیرنے کے لئے اس کلمہ کا استعمال بھی اسی وجہ سے ہے کہ پیراکی بغیر قوت اور طاقت کے ممکن نہیں ہوتی۔ اس اعتبار سے شمس وقمر کے بارے میں یہ کہنا کہ ان میں سے ہر ایک اپنے مدار میں تیرتا ہے دو مفہومات سے خالی نہ ہوگا: ایک تو یہ کہ وہ اپنے مدار پر طاقت سے جمے ہوئے ہیں، دوسرا یہ کہ وہ اپنی مخصوص سمتوں کی طرف متحرک بھی ہیں ان دنوں چیزوں کو لفظ کی تعبیر دینے کے لئے ''یسبحون'' سے عمدہ اور کوئی خوبصورت لفظ نہیں ہوسکتا تھا۔

''یسبحون'' میں ضمیر جمع عقلاء کے لئے ہے(103) جس سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ مطیع ایسے

ہی ہیں جیسے عقلمند مطیع ہوتے ہیں۔تحریکی نقطہ نظر سے آیہ کریمہ کا یہ حصہ غلامانِ مصطفےٰ ﷺ سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ تکوین کے پھیلے ہوئے ان سلسلوں سے سبق حاصل کرے اور اپنے قائد کی اتباع واطاعت میں جہاں جس جگہ اسے دین حق کا کام کرنے کی ذمہ داری سپرد کی جائے وہاں ہی وہ استقامت اور حرکت وتنظیمی اوصاف کو نہ بھولے۔گویا آسمانوں کے بے زباں سیارے اور ستارے بھی ہمہ دم متحرک اور ہمہ دم مستقیم ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۴۴﴾

''اوران کے لئے ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ اٹھایا ہم نے ان کی اولاد کو ایک بھری کشتی میں اور پیدا کیں ہم نے ان کے لئے اس (کشتی) کی مانند وہ چیزیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں اور ہم چاہیں تو ڈبو ماریں انہیں، پس ان کی آواز تک کوئی نہ سنے اور ایسے کہ نہ وہ بچائے جائیں بجز اس کے کہ ہماری طرف سے ایک رحمت ہے اور ایک وقت ہے کہ فائدہ پہنچے ہے''۔

علامہ قرطبی نے اس آیۂ کریمہ کو مشاکل قرآن میں گنا ہے۔فنی اعتبار سے اس آیۂ مقدسہ کے فہم میں کتنی بھی مشکلیں کیوں نہ ہوں، جمالیاتی لحاظ سے اس کی بصیرتیں نظر افروز ہیں۔اللہ کریم نے انسانوں کے لئے احساس عبرت، احساس نعمت اور انذار ودعوت ایسے بہت سے مضامین کو بے نقاب کرتے ہوئے سمندروں، دریاؤں کی چھاتی پر چلنے والی کشتیوں اور جہازوں کو ایک عظیم الشان نشانی قرار دیا۔مفسرین کے نزدیک ان آیات کی تفسیر دو طرح بیان کی گئی ہے۔قتادہ، جصاص، رازی، ابن جریر اور عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک کشتی سے مراد ''سفینہ نوح'' ہے(105) گویا اللہ کریم انسانوں کو یہ تاریخی نعمت یاد کروا رہے ہیں جو طوفان نوح میں بقائے انسانیت کی صورت میں ظاہر ہوئی اور پھر اسی سفینہ کو دیکھ کر جہاز رانی کی صنعت نے زور پکڑا۔اجرام فلکی کے بعد پانی پر جہازوں اور کشتیوں کا چلنا، اللہ تعالیٰ کی عطاؤں میں سے ایک عطا ہے۔یہاں ایک دلچسپ نکتہ ذہن میں رہے کہ اجرام فلکی دور ہیں اور دریا اور سمندر نزدیک لیکن بیان آیات میں اجرام فلکی کو پہلے بیان کیا گیا ہے اور سمندروں اور دریاؤں کی نعمت کو بعد میں شاید اس لئے کہ دریا اور سمندر زمین پر ہونے کے باوجود ہر شخص سے قریب نہیں ہوتے لیکن اجرام فلکی دور ہونے کے باوجود ہر نظر میں آسکتے ہیں۔شوکانی، زمخشری اور شربینی کے نزدیک مذکورہ صدر آیۂ کریمہ میں کشتی سے مراد سفینہ نوح نہیں بلکہ پانی میں چلنے والی تمام

مفردات

وَ: اور
اٰيَةٌ: ایک نشانی
لَّهُمْ: اُن کے لیے
اَنَّا: تحقیق ہم نے
حَمَلْنَا: اٹھایا ہم نے
ذُرِّيَّتَهُمْ: ان کی اولاد کو
فِي: حرف جار بمعنٰی میں
الْفُلْكِ: کشتی
الْمَشْحُوْنِ: بھری ہوئی
وَخَلَقْنَا: اور بنایا ہم نے
لَهُمْ: ان کے لیے
مِّنْ مِّثْلِهٖ: ان کی مثل سے
مَا: جس پر یا جو
يَرْكَبُوْنَ: سوار ہوتے ہیں
وَاِنْ نَّشَاْ: اور اگر ہم چاہیں ''انا حملنا'' پر جملہ کا عطف ہے
نُغْرِقْهُمْ: غرق کردیں ہم انہیں
فَلَا: پس نہ
صَرِيْخَ: مدد کے لیے فریاد کرنا
لَهُمْ: ان کے لیے
وَلَا هُمْ: اور نہ وہ
يُنْقَذُوْنَ: انقاذ سے ہے۔پانی سے باہر نکالنا
اِلَّا: مگر
رَحْمَةً: رحمت
مِّنَّا: ہماری طرف سے
وَ: حرف عطف ''اور''
مَتَاعًا: فائدہ اٹھانا ایک مدت خاص تک
اِلٰى: تک
حِيْنٍ: ایک خاص وقت

کشتیاں ہیں جو اموال اور سواریوں سے بھری ہوتی ہیں(106)۔ یہ آیۂ کریمہ ایک طرف اگر سمندر کی کوہ پیکر موجوں کے مسخر و مطیع ہونے پر دلالت کرتی ہے تو دوسری طرف اجرامِ فلکی والی علامتوں اور نشانیوں کی دلیل بھی ہے یعنی یہ کہا گیا ہے کہ شمس و قمر سے ہر ایک اپنے مدار میں تیرتا ہے۔ سوال پیدا ہوا کہ وہ کیسے تیرتا ہے؟ جواب یہ ٹھہرا کہ کشتیوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح بوجھل ہونے کے باوجود پانی میں تیرتی ہیں جو خدا پانی کی موجوں کو باربرداری کا ذریعہ بنا سکتا ہے وہ خدا اس بات پر قادر ہے کہ وہ فضاؤں میں خلائی کروں کو مختلف سیاروں کی سواری بنادے۔ آسمان سے زمین تک، کروں سے دریاؤں تک، خلاؤں سے سمندروں تک، سیاروں سے سفینوں تک، بلندیوں سے پستیوں تک، افلاک سے فلک تک، اُجالوں سے اندھیروں تک، کیا یہ سب کچھ حضرت انسان کی فکر اور سوچ کو مہمیز لگانے کے لئے کافی نہیں؟ کیا یہ سب کچھ دیکھ کر بھی کوئی دقیقہ رہ جاتا ہے؟ کوئی نکتہ بچ جاتا ہے کہ خدا کے قادر والا ہونے پر یقین نہ کیا جائے۔!!!

ماوردی نے بھری کشتیوں سے مراد عورتوں کے پیٹ بھی لئے ہیں او"ذریۃ" سے مراد مردوں کا مادہ تولید لیا اور کہا کہ آیۂ کریمہ میں انسانوں کو ان کی افزائش نسل کی نعمت یاد دلائی گئی ہے(107) اور اس قول کو اس نے حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا ہے اگرچہ حضرت علیؓ کی طرف اس قول کی نسبت ضعیف ہے تاہم قرآن مجید کے استعاراتی انداز سے بعید نہیں کہ اسلوب کی یہ ندرت اختیار کر کے انسانوں کو ان کی تخلیق وافزائش کی نعمت یاد دلائی گئی ہو۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کے ترجمہ سے بھی اس تفسیری مفہوم کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ سمجھا جا سکتا ہے(108)۔

وَخَلَقۡنَا لَهُمۡ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ مَا يَرۡكَبُوۡنَ

اس آیۂ کریمہ میں صرف "من مثلہ" کے الفاظ قابل وضاحت ہیں۔ مفسرین نے اس جملہ کو تین طرح سمجھا ہے: ایک تو یہ کہ یہاں "من مثلہ" میں اونٹ مراد ہیں(109) یعنی ہم نے کشتیوں کی طرح اونٹ پیدا کئے کہ لوگ ان سے باربرداری کی خدمت لیتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ یہاں "من مثلہ" سے مراد عالم کشتیاں اور سفینے ہیں(110) اس طرح آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے سفینۂ نوح کی طرح اور کشتیاں پیدا کیں جنہیں لوگ اپنی سواری کے کام میں لاتے ہیں اور تیسرا یہ کہ یہاں "من مثلہ" میں ہر نوعیت کی سواریاں مراد ہیں(111) اس صورت میں اس جملہ کا مفہوم تفسیری یہ ہوگا کہ کشتیوں کی طرح ہم نے فضاؤں اور خشکی میں بھی طرح طرح کی سواریاں پیدا کر دیں۔ گاڑیاں، ہوائی جہاز، ٹرامیں، سائیکلیں اور طیارے سب کی طرف اشارہ ہو گیا۔ بلاغت قرآن مجید کی عظمتیں ملاحظہ ہوں کہ پہلے آسمانوں میں اپنے مداروں پر گھومنے والے اجرام فلکی کو پیش فرمایا پھر دریاؤں کی طوفانی موجوں پر دوڑنے والے سفینوں کا ذکر کیا اور پھر سمندروں اور آسمانوں کے درمیان فضاؤں کو چیرتے ہوئے ہوائی

طیاروں، خشکی کو قدموں کی دھول بناتے ہوئے چوپایوں، وادیوں میں رینگتی ہوئی ٹرینوں اور فلک بوس چوٹیوں کی طرف لپکتی ہوئی لاریوں کا ذکر کر کے جو شخص جس سواری پر بیٹھ کر منزل کی پگڈنڈیوں پر روشنی تلاش کرنے میں سرگرداں تھا ہر اس شخص کے ضمیر کو قرآن نے "خلقنا" کی رسیوں میں باندھ لیا اور پوچھ لیا اس سے کہ اے خالق کی مخلوق سے استفادہ کرنے والے کیا تجھ پر خالق کا بھی کوئی حق ہے؟

کبھی سوچا۔۔۔۔!

کبھی غور کیا۔۔۔۔!

اور کبھی نعمتیں دینے والے منعم کی سپاس گزاری کی زحمت اٹھانے کی کوشش کی۔۔۔

اگر نہیں تو یہ وقت ہے کہ اپنے سارے وسائل، اپنی ساری سواریاں، اپنی ساری صلاحتیں اور اپنی ساری اہلتیں۔

اسے ڈھونڈنے

اسے راضی کرنے

اس سے لو لگانے

اور اس کی بندگی میں کھپانے کی کوشش کر اور ایک عزم پیدا کر، ایک حوصلہ سجا اور بول

خواہم کہ ہمیشہ در وفائے توزیم
خاکے شوم وزیر پائے توزیم
مقصود من خستہ زکونین توئی
از بہرے تو میرم از برائے توزیم

وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ

قدرت ربی، احساس نعمت اور اصلاح عقیدہ وعمل کے لئے یہاں قرآن مجید نے دو چیزوں کا ذکر کیا ہے: ایک تو اس قانون کا جس کے تحت جہاز اور آبی سفینے، طیارے اور فضائی راکٹ، پھد پھداتی سائیکلیں اور گاڑیاں، آبی موجوں، ہوائی لہروں اور خا کی منزلوں پر تیرتی، اڑتی اور دوڑتی ہیں اور دوسرا اس قانون کا سرچشمہ۔ ایک طرف دیکھئے کہ گرام بھر لوہا دریا میں پھینکئے تو وہ ڈوب جاتا ہے اور دوسری طرف لاکھوں من وزن اٹھانے والا پہاڑ پیکر جہاز سمندر کی مست اور موجزن لہروں پر تیرتا پھرتا ہے، کیا یہاں فطرت کا کوئی قانون کارفرما نہیں؟ جو آبی موجوں کو بھاری جہازوں کی سواری بنا دیتا ہے گویا تیرنے اور ڈوبنے کا ایک قانون ہے جس کے فطری زور اور قوت کے سامنے سب عقلمند سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ ایک طرف رتی بھر کا کنکر ہوا میں معلق کرنا مشکل ہے اور دوسری طرف ہزاروں من وزن

مفردات

اٹھانے والے طیارے برق رفتاری سے فضاؤں کو مسخر کر رہے ہیں۔ کیا اس کے عقب میں کوئی قانون جاری نہیں؟ یقیناً فطرت کی یہ وہ زبردست حکمتیں ہیں جو قاریٔ قرآن کو سمجھا رہی ہیں کہ آبی جہاز اور فضائی طیارے تمہیں بتاتے ہیں کہ تمہارے لئے فطرت کا قابل عمل قانون ضروری ہے اور یقیناً قرآن عظیم، رسالت مصطفوی اور ہدایت ربانی کی صورت میں موجود ہے۔ قانون فطرت پر جونہی گرفت ڈھیلی ہوتی ہے تباہی اور بربادی محاصرہ کر لیتی ہے۔ تکوین کے اس تجربہ سے حضرت انسان کو فائدہ اٹھاتے ہوئے مصطفوی قانون کے سرچشمے سے سیراب ہونے کے مواقع ضائع نہیں کرنے چاہئیں اور یہ جان لینا چاہئے کہ انسان کی رگ حیات اور گلوئے زندگی ہمہ دم رب ذوالجلال کے ہاتھ میں ہے۔ عقل نارسا کی بھول بھلیوں میں مبتلا ہو کر ابن آدم کو یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ یہ فضائیں اور یہ دریا، یہ کرے اور یہ آبی سلسلے، یہ طوفان اور بادنسیم کے خوشگوار جھونکے، یہ طیارے اور یہ گاڑیاں، یہ سفینے اور یہ چوپائے سب ہمہ دم دست تسخیر میں رہیں گے۔ فطرت کے مجرموں کی تدبیریں الٹ بھی ہو سکتی ہیں اور یہ سواریاں موت کے پنجے، یہ رحمتیں زحمتوں کے روپ اور یہ عطائیں عذاب کے جھٹکے بھی بن سکتے ہیں اور جب خدا ناراض ہو جائے۔

اللہ مددگار نہ رہے

غیبی قوت تائید نہ کرے

فطرت!

دست شفقت سر سے اٹھالے

تو

پھر

نہ کوئی دادفریاد سننے والا ہے اور نہ کوئی بچانے والا

اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ

انسان دو حالتوں سے خالی نہیں: یا تو وہ اپنے رب کریم کی نعمتوں کے دسترخوان سے ہمہ دم بہرہ مند ہو رہا ہے اور یا پھر اپنے فسق و فجور کے باوجود زحمتوں اور مصائب کے روح فرسا جھٹکوں سے بچ رہا ہے۔ تکلیف سے بچنے اور نعمت سے فیضیاب ہونے کے دو ہی فطری اصول ہیں: ایک رحمت اور دوسرا مہلت۔ زیر نظر آیۂ منورہ میں ان ہی دو سنہری اصولوں کی افادیت، ہمہ گیریت اور فیض پروری کی طرف بلیغ اور واضح اشارہ کیا گیا ہے، اگر کوئی شخص سمندر کی موجوں پر تیرتا ہے، فضاؤں کو مسخر کرتا ہے، کروں کو پھاندتا ہے، خلاؤں کو پاٹتا ہے تو یہ اس کے علم کا کمال نہیں، رب جلیل کی رحمت ہے اور وہ جب اپنی رحمت

کو واپس کرے تو کیا مجال ہے کوئی سوئی کو بھی لہروں پر تیرالے اور یہ کہ فسق و فجور کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے لوگ اگر بحر حیات سے مستفیض ہو رہے ہیں تو اس کا یہ معنی نہیں کہ فطرت غافل ہے بلکہ یہاں اس کی مہلت کا قانون جلوہ گر ہے جب وہ مقررہ وقت ختم ہو جائے، مہلت کی گھڑیاں دم توڑ جائیں تو ایک معمولی سا مچھر نمرود کو ذلیل اور خوار کر دیتا ہے۔"الا رحمة منا" میں مستفید ہونا اور "ومتاعا الی حین" میں قانون مہلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

رحمت کی ان دو کلیوں سے مل کر بننے والے پھول کی خوشبو ملاحظہ ہو
نور کی ان دو کرنوں کے مرکب سے ذوفشاں ہونے والے مہر تاباں کی روشنی دیکھئے
اور
بلندی کے ان دو زینوں سے قریب ہونے والے آسمان کی رفعت کا اندازہ لگایئے
کہ مختصر سے الفاظ کے ساتھ موت اور زندگی کے درمیان کھڑے غافل انسان کو چونکا دیا
اور وہ سوچنے لگا نہ صرف سوچنے لگا بلکہ لاپروائی اور غفلت کے بیابانوں سے بھاگ نکلنے کی کوشش کرنے لگا
آنکھوں سے غفلت کی پٹیاں کھلیں
دل بیدار ہوئے اور سچائیوں کی چوٹی پر پڑی جھوٹ کی برف پگھلنے لگی
بلاشبہ
یہ بھی رحیم آقا کی رحمت اور مہلت دینے والے مالک کے کرم کی گلی سے چلنے والا باد محبت کا روح فزا جھونکا تھا۔
غافل انسان!
دیکھ " الا رحمة منا" میں کتنی رحمتیں پنہاں ہیں
گناہ گار انسان!
دیکھ "متاعا الی حین" میں شفقتوں کا کیسا سیل رواں موجزن ہے۔
مولا! راقم سیاہ کار کو اپنی رحمتوں اور شفقتوں سے محروم نہ رکھنا۔
آمین بحرمة سید المرسلین صلی اللہ علیه و اله و اصحابه اجمعین

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَ مَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۵﴾

وَ مَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۶﴾

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۷﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ڈرو اس سے جو تمہارے سامنے ہے اور اس سے جو تمہارے پیچھے ہے تا کہ تم پر رحم کیا جائے (۴۵)

اور نہیں آتی ان کے پاس کوئی نشانی ان کے رب کی نشانیوں میں سے مگر ہوتے ہیں وہ اس سے منہ پھیرنے والے (۴۶)

اور جب ان سے کہا جائے کہ خرچ کرو اس سے جو اللہ نے تمہیں دے رکھا ہے تو کافر مسلمانوں کے لئے کہتے ہیں کہ کیا ہم انہیں کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا، تم تو نہیں مگر کھلی گمراہی میں (۴۷)

مفردات

وَاِذَا: اور جب
قِيْلَ: کہا جائے
لَهُمُ: ان سے
اتَّقُوْا: ڈرو
مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ: جو تمہارے سامنے ہے
وَمَا خَلْفَكُمْ: اور جو تمہارے پیچھے ہے
لَعَلَّكُمْ: تاکہ تم
تُرْحَمُوْنَ: رحم کیے جاؤ

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۵﴾

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ڈرو اس سے جو تمہارے سامنے ہے اور اس سے جو تمہارے پیچھے ہے تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔

اس سے پہلی آیہ کریمہ میں قانون رحمت اور فلسفہ مہلت بیان کیا گیا ہے۔ یہاں استحقاق رحمت کی اہم، وقیع اور ٹھوس بنیاد ''تقویٰ'' کا ذکر کیا ہے اور ارشاد فرمایا کہ ''جب کہا جاتا ہے ان سے کہ ڈرو اس سے جو تمہارے آگے ہے اور ڈرو اس سے جو تمہارے پیچھے ہے تاکہ رحمتیں تمہارے شامل حال ہوں''۔ یہاں ''اذا قیل'' کا فاعل رحمت عالمیاں اکی ذات بابرکات ہے اور ''لعلکم ترحمون'' میں اشارہ ان انقلاب پرور رحمتوں کی طرف ہے جو رسول کریم ﷺ کی نگاہ رحمت سے پھوٹتی ہیں اور سیرت و کردار کی تشکیل ممکن ہوتی ہے(112)۔

حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ ''ما بین ایدیکم ''(تمہارے آگے) سے مراد وہ گناہ ہیں جو پہلے انجام پائے اور ''وما خلفکم''(اور تمہارے پیچھے) سے مراد وہ گناہ ہیں جو علم حاصل ہونے کے بعد انجام پائے۔ رب کریم گویا انسانوں کی ہٹ دھرمی پر تعجب فرماتے ہیں کہ رسول عظمت ﷺ کی زبان رحمت سے نکلے ہوئے اس عطر پرور قول سے جس میں اگلے پچھلے گناہوں سے بچنے کی تلقین ہے۔ انسانوں کو کیا ہوا کہ وہ روگردانی کرتے جارہے ہیں وہ انسان کتنے بدقسمت ہوتے ہیں جو لب دریا تک پہنچ کر بھی پانی کے قطرہ قطرہ کو ترسیں۔ رسول رحمت ﷺ کی دہلیز پر کھڑے ہوکر جمال سیرت کے گل سرسبز و سرخ سے پھوٹتی خوشبوئیں سونگھ کر بھی ہدایت سے محروم رہنا بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے(113)۔

حضرت سفیان فرماتے ہیں کہ ''ما بین ایدیکم ''سے مراد عذاب دنیا ہے اور ''وما خلفکم'' سے مراد عذاب آخرت ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ غفلت کا نتیجہ محرومی ہوتی ہے۔ وہ شخص جو عصیاں شعاری ہی میں اپنی زندگی ضائع کر دیتا ہے، دنیا اسے ٹھوکریں مارتی ہے، ذلتیں اس کا گھیراؤ کرتی ہیں اور عذاب آخرت گویا اس کے تعاقب میں پوری تیز رفتاری کے ساتھ چلتا رہتا ہے، اس نوعیت کے عذابوں سے بچنے کی دعوت کا معنی یہ ہوگا کہ ان عوامل اور محرکات سے بچا جائے جو فساد آخرت کا سبب بنتے ہیں۔

بعض دیگر مفسرین نے ''سامنے سے'' مراد وہ گناہ لئے ہیں جو ظاہر اور آشکار ہوتے ہیں اور ''پیچھے سے'' مراد وہ گناہ لئے ہیں جو پوشیدہ ہوتے ہیں(114) اور بعض نے ''مابین ایدیکم'' سے

مراد عذاب آخرت اور ''وماخلفکم'' سے مراد عذاب دنیا لیا ہے(115)۔

سید قطب وغیرہ نے اس انداز بیان کو عذاب الٰہیہ کے احاطہ کرنے کے لئے کنایہ سمجھا ہے(116)۔تقویٰ کا لفظ چونکہ لغۃً بیک وقت ڈرنے اور بچنے کے معانی میں مستعمل ہے اس لئے تفسیر کی یہ ساری تعبیرات مراد لی جاسکتی ہیں۔

حضرت ابن عباس فرمایا کرتے تھے کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ آخرت کے لئے عمل کرو اور دنیا سے محتاط رہو(117)۔

والله اعلم بكتابه و مفهوم وحيه نحن لا نعلم الا ما اتنا ر بنا المحبوب بوسيلة حبيبه الرسول العظيم ورسوله الحبيب اللبيب وعليه صلوة وتحية وتسليمة وعلى اله الطاہرين الطبين واصحابه اجمعين ۔

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿٤٦﴾

''اور نہیں آتی ان کے پاس کوئی نشانی ان کے رب کی نشانیوں میں سے مگر ہوتے ہیں وہ اس سے منہ پھیرنے والے''۔

بعض لوگ ذکی الذہن ہوتے ہیں وہ کائنات میں غور وفکر کر کے ہدایت تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں لیکن ڈھٹائی اور ضد جس وقت انسانی ذہنوں کا محاصرہ کر لیتی ہے تو پھر آفاق میں پھیلے ہوئے آیات کے سلسلے بھی نافع نہیں رہتے اور ''انفس'' میں ڈوبی تاباں نشانیاں بھی ہدایت نوازی نہیں فرماتیں۔اس کے برعکس کچھ لوگ روحانی الذہن ہوتے ہیں،ان کے وجود میں جمالیاتی قدریں اور جمالیاتی حسیں نہایت گہری اور قوی ہوتی ہیں،انہیں اگر صاف ستھرے لوگوں کی سنگت میسر آجائے تو وہ ہدایت سے قریب ہو جاتے ہیں لیکن ضد اتنا بڑا مرض ہے کہ رسولوں جیسے عظیم لوگ جو سرتاپا معجزہ ہوتے ہیں ان کی صحبت بھی ضدی لوگوں کے لئے سودمند ثابت نہیں ہوتی۔دلوں کے یہ کالے لوگ اپنے آپ کو ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی کا ایسا لبادہ اوڑھا دیتے ہیں کہ انہیں رسولوں کی ذات سے پھوٹتے ہوئے نورانی سوتے بھی دکھائی نہیں دیتے۔!!

بعض لوگ اس دنیا میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو ''انفس وآفاق'' میں پھیلی عرفانی خوشبوئیں سونگھنے سے قاصر ہوتے ہیں،انہیں ان کی کور ذوقیاں اور مردہ حسیں فطرت کے مضراب سے اٹھنے والے نغموں کو سننے سے بعید رکھتی ہیں۔وہ صرف دعوے کی حد تک ''لوح وکتاب'' کے عاشق ہوتے ہیں، وہ زندہ انسانوں کی بجائے مردہ ادب کے پجاری ہوتے ہیں۔یہ لوگ بھی جب ڈھٹائی اور ضد کی مردہ ترکیبوں میں قید ہو جاتے ہیں تو الہامی اور آسمانی کتابوں کے روشن الفاظ کی طرف بھی دھیان نہیں دیتے اور بعض

مفردات

وَمَا: وحرف عطف اور ما نافیہ

تَاْتِيْهِمْ: آتی ان کے پاس

مِنْ: حرف جار معنی سے

اٰيَةٍ: نشانی

مِّنْ اٰيٰتِ: نشانیوں میں سے

رَبِّهِمْ: ان کے رب

اِلَّا: مگر

كَانُوْا: تھے وہ

عَنْهَا: اس سے

مُعْرِضِيْنَ: معرض کی جمع ہے بمعنٰی اعراض کرنے والے

لوگ ایسے ہوتے ہیں جو طبیعت کے نرم ہوتے ہیں جب کوئی شدید حادثہ دیکھتے ہیں انہیں اپنی عاقبت یاد پڑ جاتی ہے لیکن بُرا ہو ڈھیٹ ہونے کا یہ نامراد مرض انسان کو سنگ لرزاں سے بھی نیچے گرا دیتا ہے۔ مرجائیں، مٹ جائیں لوگ اپنے بُرے اعمال کے ہاتھوں کوئی ایک واقعہ بھی ضدی لوگوں کو بیدار کرنے میں کارگر ثابت نہیں ہوتا۔

ضد، ہٹ دھرمی، حسد اور بغض کے مرض میں مبتلا یہی جاہل انسان

رسولوں کی دعوت کیوں نہ سن لیں۔۔۔۔۔!

کتاب حکمت کے روشن الفاظ کیوں نہ پڑھ لیں۔۔۔۔۔۔!

کائنات کے بکھرے حسن کا مشاہدہ کیوں نہ کرلیں۔۔۔۔۔!

نفس میں ڈوبی حکمتوں کا مطالعہ کیوں نہ کرلیں۔۔۔۔۔۔!

سرکش انسانوں کے ڈوبتے سفینے کیوں نہ دیکھ لیں۔۔۔۔۔۔!

گمراہ قوموں کے بساط حیات پلٹنے کی بھنک کیوں نہ پالیں۔۔۔۔۔۔۔!

قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ باز نہیں آئیں گے۔۔۔۔۔۔!

اس لئے کہ وہ ''روگرداں'' ہیں اور ''معرضین'' ہیں آپ پھیر پھیر کر آیتیں پیش کریں۔۔۔۔!

آپ گھوم گھوم کر انہیں سمجھائیں۔۔۔۔۔!

آپ ڈوب ڈوب کر ان سے ہمدردی کا اظہار کریں۔۔۔۔۔!

آپ سارا جہاں نشانی بنا کر ان کی آنکھوں کے سامنے لے آئیں۔۔۔۔۔۔!

وہ روگردانی کے اندھیاروں میں انسانیت کے بیسیوں قافلے لٹتے دیکھ لیں۔۔۔۔۔!

وہ نہیں مانیں گے خدا کو

وہ نہیں اطاعت کریں گے الرسول مصطفیٰ ﷺ کی

وہ نہیں پڑھیں گے قرآن مجید کو

اس لئے کہ وہ مسلمین نہیں معرضین ہیں

اب پڑھئے زیر نظر آیت کا ترجمہ:

''اور نہیں آتی ان کے پاس کوئی نشانی

ان کے رب کی نشانیوں میں سے

مگر ہوتے ہیں وہ

اس سے منہ پھیرنے والے''۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

''اور جب ان سے کہا جائے کہ خرچ کرو اس سے جو اللہ نے تمہیں دے رکھا ہے تو کافر مسلمانوں کے لئے کہتے ہیں کہ کیا ہم انہیں کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا تم تو نہیں مگر کھلی گمراہی میں''۔

علامہ قرطبی نے الجامع لاحکام القرآن میں ایک روایت نقل کی کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو ابوجہل نے دیکھا کہ آپ مساکین اور حاجت مندوں سے کمال شفقت کے ساتھ پیش آرہے ہیں۔اس نے آپ سے پوچھا کہ کیا اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر نہیں کہ انہیں خود کھلائے۔حضرت ؓ نے ارشاد فرمایا ایسے ہی ہے لیکن وہ فقر اور غنا ہر دو کے ساتھ انسان کو آزماتا ہے اور یہ آزمائش فقراء کے ہاں صبر اور اغنیاء کے ہاں عطا اور خرچ کرنے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ یہ سن کر ابوجہل نے حضرت ابوبکر صدیق ؓ عنہ کو طعنہ دیا کہ ابوبکر! تم ابھی تک گمراہی میں مبتلا ہو،اس موقع پر یہ آیۂ کریمہ رسول کریم ﷺ کے مطہر سینہ پر نازل ہوئی(118)۔۔۔۔۔۔!!

اس آیۂ کریمہ میں انفاق فی سبیل اللہ اور اس کی اہمیت،مسلمانوں کی تربیتی اور روحانی ضرورتیں، منکرین حق کی مادہ پرستیاں اور انسانی زندگی پر ان کے منفی اثرات ایسے اہم موضوعات پر بلیغ ارشادات موجود ہیں۔

اسلام نے انسانی معاشرہ کی اقتصادی ضروریات پوری کرنے کی ضمانت دی ہے۔اس عظیم اور فقید المثال مقصد کے حصول کے لئے اسلام ''کسب'' کے مخالف نہیں البتہ وہ خرچ کرنے پر پورا زور دیتا ہے۔انفرادی اور غیر عمرانی سطح پر ذخیرہ خیزی،مال اندوزی اور دولت کیشی دین کی نظر میں محمود صفات نہیں بلکہ خرچ کرنا،دینا،اطعام طعام،عطا کرنا اور نوازنا وغیرہ پسندیدہ خصلتیں ہیں۔سیرت میں جب تک خرچ کرنے کی خصلت نمایاں نہ ہو شخصیت کی نشوونما ممکن نہیں ہوتی۔مسلمانوں کو اس تربیتی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے قرآن حکیم نے مال خرچ کرنے،اطعام طعام،غریب پروری اور انسانیت نوازی کو دین کی ایک اہم اور ضروری بنیاد قرار دیا اور کسی ذات کا حسن یا قبح دیکھنے کی میزان بھی یہی رکھی کہ دیکھا جائے کہ مال اور دولت کے ساتھ اس کا رویہ کیسا اور کیا ہے۔اگر نفس میں بخل رچا بسا ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابھی ایمان نے اس کی ذات پر کوئی اثر نہیں چھوڑا۔کامل شخصیتیں وہی ہوتی ہیں جن میں امر ربی کی تعظیم اور مخلوق پر شفقت کے دواعی پائے جائیں۔انسان جس وقت ڈھیٹ اور عقل کا اندھا ہو جاتا ہے تو اس کی شخصیت ان دونوں اخلاقی اور روحانی اصولوں کے نور سے محروم ہو جاتی ہے اور

مفردات

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ: اور جب کہا جائے ان سے

اَنْفِقُوْا: خرچ کرو

یہ لفظ مادے کے اعتبار سے نفق ہی سے ماخوذ ہے اور نفق اس سرنگ کو کہتے ہیں جس کے داخل ہونے اور نکلنے کے دونوں راستے کھلے ہوں۔ ''انفقہ'' جنگلی چوہے کے بنائے ہوئے مختلف راستوں میں سے ایک راستہ۔ یہ مادہ جب باب افعال میں استعمال ہو یعنی ''انفاق'' کی صورت میں تو اس کا معنٰی اپنی دولت کو کھلا رکھنا اور خرچ کرنا ہوگا

مِمَّا: اس سے

رَزَقَكُمُ اللّٰهُ: جو اللہ نے دیا ہے تمہیں

قَالَ: کہا

الَّذِيْنَ: ان لوگوں نے

كَفَرُوْا: جو کافر ہوئے

لِلَّذِيْنَ: ان لوگوں کے لیے

اٰمَنُوْٓا: جو ایمان لائے

اَنُطْعِمُ: کیا ہم کھلائیں

مَنْ: انہیں، جو، جسے

لَّوْ: اگر

يَشَآءُ اللّٰهُ: چاہے اللہ

اَطْعَمَهٗٓ: کھلائے اسے

اِنْ اَنْتُمْ: نہیں تم

فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ: کھلی گمراہی میں

بدفکری کی تاریکیوں میں سرگرداں ایسا شخص نہ تو اپنی ذات کے ساتھ انصاف کرسکتا ہے اور کوشش کے باوجود نہ وہ اس قابل رہتا ہے کہ اللہ کی مخلوق کے حقوق پوری طرح ادا کرسکے۔

مسلمان جب کفار سے کہتے کہ ''اللہ رب العزت نے تمہیں اتنا کچھ دے رکھا ہے تو تم فقراء اور معاشی لحاظ سے بدحالی کے شکار لوگوں کو اس میں حصہ مند کیوں نہیں بناتے''۔ کفار کہتے کہ ''ہم اللہ کی رضا پر راضی ہیں، جب اس نے خود انہیں اس حالت فقر میں رکھنا پسند کیا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں کہ اس کی مشیت کے مخالف ہوں کہ جنہیں خدا بھوکا رکھنا چاہتا ہے انہیں ہم کھلائیں اور جنہیں وہ مسکین رکھنا چاہتا ہے انہیں ہم تونگر بنائیں، ایسے سوچنا ہی گمراہی ہے'' (119)۔

دیکھیے! اس قول اور سوچ میں تین قباحتیں ہیں ایک تو یہ کہ خرچ کرنے سے جان چھڑانا اور دوسرا تنگ دست لوگوں اور فقراء کا مذاق اڑانا اور تیسرا مسلمانوں کے عقیدہ توحید پر پھبتی کسنا کہ تم جس خدا کو قادر اور رزاق ورازق مانتے ہو، کیا وہ خود ان لوگوں کی ضروریات پوری نہیں کرسکتا؟ یہی وہ فکر ونظر اور حرکت وعمل کی گمراہی ہے جسے قرآن حکیم '' ان انتم الا فی ضلال مبین '' سے تعبیر کررہا ہے۔

بعض ائمہ نے ''ان انتم الا فی ضلل مبین'' کو کفار کا قول قرار دیا ہے (120)۔ دریں صورت آیت کا مفہوم تفسیری یہ ہوگا کہ مسلمان جب معاشرہ کی اقتصادی خوشحالی کے لئے فقراء ومساکین کی مدد کے لئے پکارتے تو کافرین مسلمانوں کو کہتے کہ تم عجیب گمراہی میں مبتلا ہو کہ اللہ تو انہیں مسکین رکھنا چاہتا ہے اور تم اللہ کی چاہت کے مخالف فلاح وصلاح کی تحریکیں اٹھاتے پھرتے ہو۔ یاد رہے کہ مادہ زاد دنیا میں ہمیشہ ایسے ہی افکار کے سہارے جیا کرتے ہیں۔ جب ٹھوس اصولوں، انقلابی اعمال اور صالحانہ رویوں کا مقابلہ زور استدلال سے ممکن نہیں رہتا تو پھر وہ پھبتیوں، طعنوں اور الزام تراشیوں پر اتر آتے ہیں اور سیدھی اور سادی باتوں میں بھی اپنی چالاکیوں کا فلسفہ بگھارنے لگ جاتے ہیں اور اپنے معاشی وسائل کو دین سے برگشتگی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ قرآن مجید ایسے ہی گھسے ہوئے، بے ربط، نامناسب اور آوارہ افکار کو گمراہی قرار دیتا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾

مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿۴۹﴾

فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾

قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَ صَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور وہ کہتے ہیں کہ کب یہ وعدہ پورا ہوگا بتاؤ اگر تم سچے ہو (۴۸)

دراصل وہ انتظار میں نہیں بجز اس کے کہ ایک آسمانی چیخ انہیں آگھیرے اس حال میں کہ وہ جھگڑ رہے ہوں (۴۹)

اس طرح کہ پھر انہیں وصیت کرنے کا موقع ملے اور نہ ہی وہ اپنے گھر والوں تک پلٹ سکیں (۵۰)

اور صور پھونکا جائیگا تو فوراً وہ اپنی قبروں سے اپنے رب کے حضور پیش ہونے کیلئے دوڑتے ہوئے جائینگے (۵۱)

کہیں گے ہائے ہماری بدبختی! ہمیں کس نے اٹھا دیا ہماری خوابگاہ سے (آواز آئے گی) یہ ہے وہ جس کا وعدہ رحمٰن نے کیا تھا اور رسولوں نے تصدیق کی تھی (۵۲)

وہ نہ ہوگی مگر ایک زوردار آواز پھر تو اسی وقت وہ سب ہمارے حضور حاضر کر دیئے جائیں گے (۵۳)

مفردات

وَيَقُوْلُوْنَ: اور کہتے ہیں وہ
مَتٰى: کب
هٰذَا: یہ
الْوَعْدُ: وعدہ (پورا ہوگا)
اِنْ كُنْتُمْ: اگر ہو تم
صٰدِقِيْنَ: سچے

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ کب یہ وعدہ پورا ہوگا بتاؤ اگر تم سچے ہو''۔

اس آیت کی تفسیر میں ہماری گفتگو ''ان کنتم صدقین'' سے شروع ہوگی۔ منکرین حق کے لئے یہ کوئی مسئلہ نہ تھا کہ وہ ''توحید'' کے دلائل کو منطقی تصور کرتے ہیں یا دور از دلیل۔ اصل میں وہ سمجھ رہے تھے کہ رسول اکرم ﷺ اور ان کے نیک دل اور خوب سیرت ساتھیوں کی دعوت کا پھیلنا، ان کی باطل اور فاسقانہ تہذیب کی موت ہے جبکہ حالت یہ تھی کہ ان کی تجارت سے لے کر معاشرتی بندھنوں تک، معاشی چکروں سے لے کر سماجی سوچوں تک، جھوٹ اور کذب کا کامل تسلط تھا۔ ان حالات میں ان بہانہ ساز، حیلہ گر، مکر خو منکرین کی ضرورت یہ تھی کہ وہ رسول اکرم ﷺ کی معاشرتی حیثیت کو مجروح کرتے، خصوصاً حفظ کردار اور اعتماد کا جو زبردست رنگ آپ ﷺ کی ذات میں پایا جاتا تھا وہ آپ کا صادق اور امین ہونا تھا، اب منکرین کی کوشش یہ تھی کہ پورا زور لگا کر حالات کو کچھ ایسا پلٹا دیا جائے کہ لوگ رسول اکرم ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو سچا نہ سمجھیں۔

ایسی قوم جو داعی حق کو بدنام کرنے کا گھٹیا سے گھٹیا بہانہ تلاش کر رہی ہو اور داعی حق تکرار کے ساتھ دعوت حق کے رد کرنے کے بھیانک اور وحشت انگیز نتائج کی تنبیہات سنا رہا ہو اور نتائج میں کچھ نتیجے ایسے بھی ہوں جن کے رونما ہونے میں ابھی کچھ دیر ہو بتایئے؟ استہزا کا طوفان اٹھانے والوں کے لئے اس سے زیادہ بہتر موقع اور کون سا ہوگا کہ بات کی کھال نہ اتاریں۔ رسول اکرم ﷺ وقوع قیامت اور اللہ کے عذاب کی قرآنی دھمکیاں اور سچائیاں سنا رہے تھے اور ڈھیٹ منکرین بہانوں کے دوش پر سوار بغلیں بجا رہے تھے اور ہنگامہ کھڑا کر رہے تھے کہ بتاؤ! بتاؤ! ذرا جلدی بتاؤ! کہ قیامت کب آ رہی ہے؟ تاریخ بتایئے؟ ۔۔۔۔۔ دن بتایئے؟ ۔۔۔۔۔

اگر سچے ہو تو دیر کاہے کی؟ ۔۔۔۔

قیامت لائی ہوتی

عذاب دکھایا ہوتا

سمندر بھڑکائے ہوتے

پہاڑ رائی اور ستارے بے نور کئے ہوتے

اگر یہ سب کچھ نہیں ہو رہا تو بتاؤ ہم تمھاری کون سی بات مانیں؟

قاریٔ قرآن!

جولوگ دیکھی گئی چیزوں سے عبرت حاصل کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوجائیں ان لوگوں کا ان دیکھی چیزوں پر ورطۂ حیرت میں مبتلا ہوجانا قابل تعجب نہیں ہوا کرتا۔ جولوگ ظاہر کا نور برداشت کرنے کی اہلیت ضائع کردیں باطن میں گھٹیا اور پوشیدہ چیزوں پر اصرار کرنا ان کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ وہ قومیں جو ماضی اور حال کی اٹل حقیقتوں اور قطعی صداقتوں کو جھوٹا ثابت کرنے کی کھلاڑی ہوں وہ ہمیشہ مستقبل کی پیشین گوئیوں میں سچ کو مشکوک کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مشرکین مکہ کا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا وہ اپنی آنکھوں سے ماضی کی وہ سچی کتاب پڑھ رہے تھے جو حضور ﷺ نے ان کے سامنے کھولی تھی۔ وہ بخوبی یہ ملاحظہ کر چکے تھے کہ نبی کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک حرف صداقت کا نور تاباں رکھتا ہے لیکن ان کی کوشش یہ تھی کہ معاشرہ کی نظر ماضی اور حال دونوں سے پھر جائے، حالانکہ یہ بات سمجھنا ان کے لئے کوئی دشوار نہ تھا کہ کسی خاص وقت کے ساتھ مقید وعدہ اگر اس خاص گھڑی سے مقدم یا مؤخر ہوجائے تو جھوٹ بن جاتا ہے۔ اگر قیامت حضور ﷺ کی دعا سے مقدم ہوجاتی تو پھر وعدہ کا ہے کا رہتا۔ خدا کے وعدے اپنے مقررہ وقت پر ہی پورے ہوتے ہیں ان میں نہ تقدم ہے اور نہ تأخر۔ کسی انسان کی خواہش اس کے ارادے میں دخل انداز نہیں ہوسکتی۔

مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ۝۴۹

''وہ انتظار میں نہیں بجز اس کے کہ ایک آسمانی چیخ انہیں آگھیرے اس حال میں کہ وہ جھگڑ رہے ہوں''۔

ائمہ تفسیر نے زیر نظر آیہ کریمہ کی تفسیر میں ''ینظرون'' کو ''ینتظرون'' کے معانی اور ''صیحة'' کو نفخہ اولیٰ کے مفہوم میں سمجھا ہے اور ''یخصمون'' کو ''یتخاصمون'' کا معنوی جامہ دیا ہے(121)۔ دریں صورت آیت کا مفہوم تفسیری یہ ہوگا کہ '' وہ لوگ جو انبیاء اور رسولوں کو سچا نہیں جانتے اور وقوع قیامت کی خبروں پر عبرت گیری کی بجائے استہزاء اور بدتمیزی کا طوفان اٹھاتے ہوئے ہنگامہ کھڑا کردیتے ہیں کہ لاؤ تمھارے وعدے کب پورے ہوں گے اور قیامت کب قائم ہوگی۔ انہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ اسی طرح بحث وتمحیص میں وقت ضائع کررہے ہوں گے۔ ان کے یہ جھگڑے جھمیلے جاری ہوں گے اور وہ انتظار کی حیرتوں میں گم ہوں گے''۔ گویا ایک طرف انہیں مادی اور دنیوی جھگڑے گھیر رکھے ہوں گے اور دوسری طرف ان کی فکری بوالعجبیاں رسولوں کی عالمگیر سچائیوں سے دور رکھے ہوں گی کہ دفعۃً قیامت بپا ہوجائے گی۔ وقوع

مفردات

مَا: نہیں۔ ''ما'' نافیہ

يَنْظُرُوْنَ: ''النظرة'' سے ماخوذ ہے، بمعنٰی انتظار کرتے ہیں

اِلَّا: مگر

صَيْحَةً: لغوی معنٰی وہ آواز ہوتا ہے جو شدید غصہ کے وقت یا فریاد کرتے ہوئے شدت حلق سے نکلے، لیکن قرآن مجید میں عام طور پر اس لفظ کا اطلاق بجلی کی کڑک پر ہوا ہے

وَّاحِدَةً: ایک

تَاْخُذُهُمْ: ان کو پکڑے

یہاں مجازاً معنٰی ہلاک کرنا ہوگا

وَهُمْ: اور وہ

يَخِصِّمُوْنَ: اس کا مادہ خ، ص، م ہے ''الخصومة'' جھگڑا، الخصم جھگڑا کرنے والا یہاں معنٰی ہوگا جھگڑتے ہوں گے

مفردات

قیامت کا حادثہ اتنا ناگہانی ہوگا کہ ان کے وہم وتخیل کی سریع کاری بھی اس کا تعاقب نہ کر سکے گی۔۔۔۔۔!!

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے حضور انور ﷺ سے روایت کرتے ہوئے قیامت کے ناگہانی وقوع کی کیفیت بھی نقل فرمائی ہے کہ لوگ بازاروں، راستوں اور اپنی مجلسوں میں بے فکر بیٹھے ہوں گے یہاں تک کہ ایک کپڑا بیچنے والا کپڑا پھیلائے دکھا رہا ہوگا اور خریدار اسے دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ سے چھو بھی نہ پائے گا کہ صور پھونک دیا جائے گا جس سے تمام لوگ ہلاک ہو جائیں گے۔۔۔۔۔!!

یہاں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ آیۂ مذکورہ میں ایک مفہوم وہ ہے جو استثنا سے پہلے ہے اور ایک مفہوم وہ ہے جو استثنا سے بعد میں ہے۔ مفہوم قبل الاستثنا "ما ینظرون" ہے اور مفہوم بعد الاستثنا "الا صیحة واحدة" ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ استثنا اپنے ماقبل اور مابعد واقع ہونے والے دونوں مفہومات میں یکساں زور پیدا کرتی ہے، اس اعتبار سے آیت میں تفسیری عمود ایک تو قیامت کا اچانک واقع ہونا ہوگا اور دوسرا منکرین رسول کا "ماینظرون" کی کیفیت میں سرگرداں رہنا ہوگا یہاں اگر "ماینظرون" کو "ماینتظرون" کے معنوں میں استعمال نہ کیا جائے بلکہ "نظر" ہی کے مفہوم میں سمجھا جائے تو تفسیری عمود مزید نکھر کر سامنے آئے گا۔

راغب اصفہانی لکھتے ہیں(122):

> "کسی چیز کے مشاہدے یا ادراک کے لئے غور وفکر کرنے، جستجو رکھنے اور جستجو کرنے سے جو معرفت حاصل ہو اس سب کے لئے لفظ "نظر" استعمال ہو جاتا ہے"۔

اس اعتبار سے "ماینظرون" کہہ کر قرآن حکیم انبیاء کرام اور ان کے ساتھی "صادقین" کو گویا سمجھاتا ہے کہ آپ جتنا بھی زور لگائیں اور سچائیوں کو جتنا بھی نکھار کر ان ڈھیٹ منکرین کے سامنے رکھ دیں یہ اپنی ہٹ دھرمی کے خول سے باہر نہیں نکلیں گے، اس لئے کہ ان کے وجود میں جستجو کا خمیر ٹھنڈا پڑ چکا ہے اور غور وفکر کرنے کا مادہ نابود ہو چکا ہے۔ اب ان میں اور پتھر کی سلوں میں کچھ فرق باقی نہیں رہا۔ انہیں رسولوں کو سچا نہ سمجھنے کی گستاخی نے اس قدر ناکارہ کر دیا ہے کہ نہ سوچ سکنا بذات خود ان کے لئے عذاب بن چکا ہے، ایسا عذاب جو شعلہ بداماں آگ سے بھی زیادہ تباہ کن ہے۔ اب یہ لوگ اس کیفیت میں مبتلا ہوں گے کہ قیامت واقع ہو جائے گی۔

"صیحة" کا بنیادی معنی وہ آواز ہے جو لکڑی یا کپڑے کو چیرنے یا پھاڑنے سے پیدا ہو، یہی وجہ ہے کہ بعض بزرگوں نے "صیحة" کا معنی مطلق عذاب بھی لیا ہے جس کے تحت آیت کی معنوی تعبیر یہ ہو

گی کہ وہ لوگ جو مسلسل نظر وفکر کے باغی بنتے جارہے ہیں اور اپنے آپ کو رسولوں کا مزاحم بنانے کی گستاخی ایسے قبیح جرم میں مبتلا کررہے ہیں، انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ خدا کا عذاب اعلان کر کے نمودار نہیں ہوا کرتا اس کی گرفت دفعتاً اور اچانک ہوا کرتی ہے۔ اس کی تقدیر کی تعزیریں تمام تدبیروں کو یکسر پلٹ دیتی ہے اور اس کی گرفت کی چیخیں زندگی کے تمام سریلے نغموں کو دبا لیتی ہیں اس طرح کہ پھر انسانی حواس کے رفیع محلات ویران کھنڈر بن جاتے ہیں اور جمال پرور وجود تباہ شدہ سیاہ سڑے ہوئے ریگ زاروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

العیاذ با للہ السمیع العلیم العزیز الرحیم

والصلوٰۃ والسلام علی حبیبہ الکریم العظیم الروف الرحیم

وعلی الہ الطاہرین الطیبین و اصحابہ اجمعین

فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

”اس طرح کہ پھر انہیں نہ تو وصیت کا موقع ملے اور نہ ہی وہ اپنے گھر والوں تک پلٹ سکیں“۔

دنیا کے خاتمے کی یہ چیخ اتنی اچانک ہوگی کہ جو جس حالت میں ہوگا اسی میں رہ جائے گا اتنی فرصت بھی نہ ہوگی کہ دو بول وصیت ہی کے زبان سے ادا کر دیئے جائیں۔ عام طور پر وقوع حادثات کے موقعوں پر انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے ٹھکانوں کی طرف بھاگتا ہے بال، بچوں اور گھر بار کی اسے فکر لاحق ہوتی ہے یہاں تک کہ موت ایسی سریع اور تیز رفتار وقوعی حقیقت بھی کبھی اتنی فرصت ضرور دے دیتی ہے کہ بیوی بچے سرہانے بیٹھ جاتے ہیں اور دنیا چھوڑنے والا شخص انہیں امور دنیا میں رہنمائی بہم پہنچاتے ہوئے وصیت کے چند لفظ ادا کر لیتا ہے لیکن قیامت ایسے نہیں آئے گی بلکہ اس کا وقوع اتنا اچانک دفعتاً اور بے خبری میں ہوگا کہ کوئی شخص اپنی جگہ سے ہل بھی نہ پائے گا۔ چہ جائیکہ وہ اپنے اہل وعیال تک پہنچ سکے یا پھر اپنے پاس ہی کے کسی ساتھی اور دوست کو اپنے کسی اہل معاملہ میں یا اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے لئے وصیتاً کوئی پیغام دے سکے ہر گز ایسا نہ ہو سکے گا۔

”توصیۃ“ میں تنوین تفخیم کی بھی ہو سکتی ہے اور تنکیر کی بھی:

پہلی صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ”معاملہ کتنا ہی بڑا، جلیل الشان اور اہم کیوں نہ ہو وہ وصیت تک نہ کر پائیں گے“۔

اور دوسری صورت میں آیۂ کریمہ کے اندر اشارہ اس طرف ہوگا کہ ”وقوع قیامت پر انہیں کوئی چھوٹی سی وصیت کرنے کی فرصت بھی نہ ہوگی“۔

مفردات

فَلَا: تو نہ

يَسْتَطِيْعُوْنَ: طاقت رکھیں گے

تَوْصِيَةً: وصیت

وَّلَآ: اور نہ

اِلٰٓى: کی طرف۔تک

اَهْلِهِمْ: اپنے گھر والوں

يَرْجِعُوْنَ: لوٹ سکیں گے

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾

''اور صور پھونکا جائے گا تو فوراً وہ اپنی قبروں سے اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لئے دوڑتے ہوئے جائیں گے''۔

پچھلی آیۂ کریمہ میں قیامت کے ناگہانی وقوع کا جو منظر پیش کیا گیا اس سے یہ بھی سوچا جا سکتا تھا کہ جب موت ہی آ گئی تو پھر حساب کس سے ہوگا؟ باز پرس کس طرح ہوگی؟ کون پوچھے گا؟ اور کب پوچھے گا؟ باطل تخیلات اور بے سود وسواس کے اندھیروں سے قاریٔ قرآن کو نکالنے کے لئے ان مراحل کی طرف کتابِ حکمت نے اشارات شروع کئے جو موت کے بعد پیش آئیں گے گویا کہا گیا:

اے مخاطبین رسول!

اے سامعین نغمہ حق!

تمہیں آج جو قبریں دکھائی دے رہی ہیں، تم جن کے بارے میں یہ تصور لئے بیٹھے ہو کہ وہ مٹی کے پتلے ہیں، تم جن کے بارے میں یہ سمجھتے ہو، یہ وہ مردہ ڈھانچے ہیں، جن سے زندہ روحیں بھاگ چکی ہیں، یہ یوں کے یوں ہی رہیں گے، نہیں نہیں جس طرح یہ ایک ہی آواز سے بے جان مٹی ہو گئے تھے، ایک ہی صدا پر یہ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ان کی مردہ ہڈیوں کو زندگی کا لباس پہنا دیا جائے گا اور یہ حیات کا جامہ زیب تن کر کے اپنے رب کی طرف دوڑیں گے۔

قارئین!

''الیٰ ربھم ینسلون'' (اپنے رب کی طرف دوڑ چلیں گے) میں جذبوں کا ایک سمندر موجزن ہے اور بلاغت کی رفعتیں فوق ثریا پھیلی معلوم ہوتی ہیں۔ جو انسان آج خدا کی طرف دیکھنا پسند نہیں کرتے اور غفلت میں استغراق کا عالم یہ ہے کہ ایک قدم خدا کی طرف نہیں اٹھتا، جو آج اس کی طرف چلتے نہیں وہ کل اس کی طرف دوڑیں گے، لیکن کل ان کا دوڑنا اور تیز چلنا اپنی مرضی سے نہ ہوگا بلکہ مجبوری سے ہوگا گویا انہیں گردن سے پکڑ کر رب کی طرف تیز ہانکا جائے گا، لیکن جو آج ذوق وشوق اور حب و عشق کی راہوں پر چلنے والے خوب خو مسافر ہیں وہ کل جب صور اسرافیل سنیں گے تو یہ ایمان پرور، زندگی بخش، سرور آفریں اور لذیذ آواز گویا ان کے پاؤں میں بجلیوں کی تیزی بھر دے گی اور وہ ذوق وشوق کے عالم میں اپنے رب کی طرف دوڑ پڑیں گے کہ کہیں تسلیم ورضا کا بادہ ٹھنڈا نہ پڑ جائے اور ان کے مسلک محبت پر آنچ نہ جائے، جس کی محبت جس قدر زیادہ ہوگی اتنی اس کی رفتار تیز ہوگی اس لئے کہ وہ اپنے رب کی طرف جا رہے ہوں گے۔ ''ینسلون'' یعنی ''تیز چلنا'' ذوق وشوق پر دلالت کرتا ہے۔ ''الی ربھم'' یعنی ''اپنے رب کے'' الفاظ محبوب خدا سے قلبی وابستگیوں اور جنونی کیفیتوں کا مظہر دکھائی

مفردات

وَ: اور

نُفِخَ: پھونکا گیا
فعل ماضی مجہول صیغہ اور مذکر غائب

فِي: میں بیچ

الصُّوْرِ: حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے صور کا معنٰی بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ''الصور القرن'' یعنی صور نرسنگا ہے
(ترمذی۔ مسند)
عربی میں شاخ کو ''صور'' کہتے ہیں بعض کے نزدیک ''صور'' صورۃ کی جمع ہے۔ بمعنٰی پیکر انطباق معنٰی یہ ہوگا کہ مردہ پتلوں میں روحیں پھونکنا۔ مذہبیات میں وہ چیز صور کہلاتی ہے جو حضرت اسرافیل علیہ السلام مخلوق کو مارنے اور جلانے کے لیے پھونکیں گے''۔ (لغات القرآن)

فَاِذَا هُمْ: تو فوراً وہ

مِّنَ: سے

الْاَجْدَاثِ: جدث کی جمع ہے بمعنٰی قبریں
لغوی لحاظ سے جدث پیوست ہونے کو کہتے ہیں۔ قبر میں بھی چونکہ اجزائے بدن اجزائے قبر میں پیوست ہو جاتے ہیں اس لیے اسے جدث کہہ دیتے ہیں

اِلٰى رَبِّهِمْ: اپنے رب کی طرف

يَنْسِلُوْنَ: اس کا مادہ ہے: نسل ینسل نسلاً ونسلاناً۔ تیزی سے بھاگنا سرعت سے چلنا، جانے میں عجلت برتنا اور چیونٹیوں کی نال کی طرح ایک دم سے نکل جانا (تاج العروس)

دیتے ہیں۔رہی گنہگار انسانوں کے لئے اس ترکیب کی حکمت تو "ینسلون" میں ان کا تیزی سے ہانکا جانا مراد ہے اور "الی ربھم" میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس رب کو تم آج اپنا نہیں سمجھ رہے کل تمہیں طوعاً یا کرہاً اسے اپنا تسلیم کرنا پڑے گا۔

قبروں سے نکلنے کی کیفیت کو قرآن مجید نے مختلف مقامات پر بیان کیا ہے۔سورۂ زمر میں ارشاد باری ہے:

ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ (زمر:68)

"پھر صور پھونکا جائے گا تو دفعتاً سارے کے سارے کھڑے ہو کر دیکھ رہے ہوں گے"۔

یہاں ذہن میں یہ اشکال وارد ہوسکتا ہے کہ ایک جگہ کھڑے ہو کر دیکھنا ذکر کیا گیا ہے اور دوسری جگہ اپنے رب کی طرف تیزی سے چلنا مذکور ہے گویا قبروں سے نکلنے کی کیفیت میں تضاد نظر آتا ہے۔ مفسرین نے اس اشکال کو یوں رفع کیا ہے کہ پہلے ہلہ میں قبروں سے نکلنے والے خوفناک مناظر دیکھ کر ہکا بکا رہ جائیں گے اور پھر فرشتوں کے ہانکنے سے دوڑنا شروع کر دیں گے۔ یہ تاویل گنہگار انسانوں کے لئے تو اختیار کی جاسکتی ہے لیکن نیکیوں کے نور میں نہانے والے اہل دل کے لئے ہرگز ایسا نہیں سوچا جاسکتا۔ممکن ہے جب وہ قبروں سے نکلیں تو ماحول کا جائزہ لینے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے کھڑے ہوں اور پھر جب اشرقت الارض بنور ربھا" اور جگمگا اٹھی زمین اپنے رب کے نور سے" کا منظر ان کی نگاہوں کے سامنے بے حجاب ہوگا تو وہ بے ساختہ اپنے رب کی طرف دوڑنے لگ جائیں گے۔

زیر نظر آیۂ کریمہ میں سبق یہ ہے کہ جس چیز کو ناممکن سمجھا جا رہا ہے اللہ کے ہاں وہ کچھ مشکل نہیں کہ وہ جب چاہے جو چاہے، ہوسکتا ہے قیامت لانے کے لئے اسے کسی خاص اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں بس ایک آواز ہی سے لوگ فنا ہوسکتے ہیں اور ایک آواز ہی سے وہ سب اکٹھے ہوسکتے ہیں۔

صور پھونکنے کے لئے "نفخ" فعل ماضی کا استعمال وقوع قیامت پر یقین کی پختگی کے لئے ہے تاکہ جانا جاسکے کہ یہ معاملہ ایسا ہی ہے جیسے ماضی میں ہو چکا ہے۔

واللہ اعلم و رسولہ بحقیقۃ التفسیر و صلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ و سلم علیہ کثیراً کثیرا

قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾

"کہیں گے ہائے ہماری بدبختی ہمیں کس نے اٹھا دیا ہمارے خوابگاہ سے (آواز آئے گی) یہ ہے وہ جس کا وعدہ رحمٰن نے کیا تھا اور رسولوں نے تصدیق کی تھی"۔

مفردات

قَالُوْا: کہیں گے یا کہا انہوں نے

يٰوَيْلَنَا: یہ لفظ "یا" حرف ندا اور "ویلنا" کا مجموعہ ہے۔اس کا معنٰی ہوگا" ہائے ہماری بربادی" کلمہ تحسر اور تعجب ہے۔ "ویل" کے مختلف معانی وارد ہوئے ہیں۔شر اور بدی میں داخل ہونا۔جہنم کی ایک وادی یا پہاڑ کا نام بھی ویل ہے "ویلہ" رسوائی اور تباہی۔"ویلنا" میں ضمیر متکلم کی طرف اضافت ہے!

مَنْ: کس نے

بَعَثَنَا: "بعث" مصدر ہے۔اٹھانا، ابھارنا، بھیجنا، آزاد چھوڑ دینا اور موانع دور کرنا اس کے مستعمل معانی ہیں

مَنْ بَعَثَنَا: کس نے اٹھایا

عام قراء 'میم' کی زبر اور بعث کو فعل کی حیثیت میں پڑھتے ہیں یعنی ماقبل کی خبر اور ضحاک اور ابن عباس رضی اللہ عنہما میم کی کسرہ کے ساتھ حرف جار اور بعث مصدر مجرور پڑھتے ہیں

مِنْ: سے

مَّرْقَدِنَا: "رقاد" سے ہے مصدر یا ظرف مکان ہے بمعنٰی خواب گاہ!

هٰذَا: یہ

مَا: موصولہ جو

وَعَدَ: فعل ماضی، معروف وعدہ کیا

الرَّحْمٰنُ: رحمٰن

وَ: اور

صَدَقَ: سچ فرمایا یا تصدیق کی

الْمُرْسَلُوْنَ: جمع مرسل رسول

دم اسرافیل کی اعجاز کاریوں سے جب ٹوٹے ہوئے بندوں، بکھری ہوئی ہڈیوں، مرگ چشیدہ حواس، اکھڑے ہوئے بالوں اور مٹے ہوئے اجسام میں زندگی رینگنے لگے گی اور لوگ اپنی قبروں سے زندگی کا جامہ زیب تن کر کے باہر نکلیں گے تو ان کی عقلیں ماری ماری ہوں گی، ماحول کی تعجب ناکیاں اٹھنے والوں کے ضمیر سے سوال کریں گے بتاؤ لوگو! کل جب تمھارے سامنے سچے رسول اس دن کا نقشہ کھینچا کرتے تھے تو تم دوبارہ زندہ ہونے کو امر محال تصور کیا کرتے تھے بلکہ تمہاری عقل نارسا کی شرم سوزیاں مرسلین کا مذاق اڑایا کرتی تھیں اور علم خداداد سے مستقبل کا دل چیرنے والے وہ نبی اپنی سادگی، للّٰہیت اور خدا پرستی کی بنا پر انجان محسوس ہوتے تھے۔ تمہیں خود پرستیوں کے نشہ نے اس قدر مجنون بنا دیا ہوا تھا کہ سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنا تمھارے لئے مشکل ہو گیا تھا۔ لو! آج تم خود فیصلہ کرلو! پھر تو وہ پیٹیں گے اور کہیں گے ہائے ہماری بدبختی ہم نہ سمجھ سکے کہ اس طرح ہمارے وجود کے ریزوں سے زندگی نمودار ہوگی ہم جن قبروں کو خواب گاہ تصور کرتے رہے درحقیقت وہ ہماری حماقتوں اور نادانش مندیوں کی تماشا گاہ ہے۔

قاریٔ قرآن کو قبور و مراقد اور خروج وظہور کے مناظر میں دلچسپی لینے کی بجائے ان لوگوں کے احوال سے عبرت گیری چاہیئے جو "یٰویلنا" کہہ کر چیخیں گے۔ کل جو لوگ اپنے آپ کو خوش بخت اور تابندہ بخت تصور کرتے تھے آج کیوں وہ اپنے آپ کو کم بخت کہیں گے ان کی بے بسی اور حرماں نصیبی بھی اپنی جگہ باعث عبرت ہے لیکن جاننے کے لائق یہ امر ہے کہ وہ کیا گندے عقیدے اور گرے ہوئے اعمال تھے جن کی بنا پر آج یہ لوگ سونے کو جاگنے پر اور مرنے کو زندہ ہونے، سکوت کو گفتار پر اور جمود کو حرکت پر ترجیح دیں گے۔ یقیناً ان کا جرم یہی تھا کہ وہ رسولوں کو سچا نہیں سمجھتے تھے وہ مرسلین کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ انہیں اپنا وجود آسمان دکھائی دیتا تھا اور رسولوں کا وجود لباس بشریت میں محصور ومحدود۔ وہ اپنے علم کو پہنائیوں کا سیارہ تصور کرتے اور نبیوں کے علم کو محدود۔ یہی ان کی گستاخیاں تھیں جو آج ان کی زبانوں سے چیخیں بن کر نکلیں گی۔

قَالُوۡا یٰوَیۡلَنَا مَنۡۢ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ وَصَدَقَ الۡمُرۡسَلُوۡنَ

رسالت مآب ﷺ کی سچائیوں سے انکار کرنے والے اپنی قبروں کو خوابگاہ کیوں سمجھیں گے۔ اس سوال کا جواب ائمہ تفسیر نے مختلف طریقوں سے دیا ہے۔

حضرت ابی ابن کعب، حسن بصری، مجاہد، قتادہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں نفخہ اول اور نفخہ ثانی کی درمیانی مدت کے لئے عذاب قبر دور کر دیا جائے گا اور ایک میٹھی سی نیند قبر والوں پر طاری ہو جائے گی۔ دوسری مرتبہ جب صور پھونکا جائے گا تو قبروں سے لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اسی موقع پر قبروں سے اٹھ کر نکلنے والے کہیں گے ہائے ہمیں کس نے ہماری خوابگاہوں

مفردات

اِنۡ كَانَتۡ: نہیں ہوئی وہ
اِلَّا: مگر سوائے اس کے
صَيۡحَةً: چیخ، زوردار آواز، کڑک
''صیحۃ'' مرفوع اور منصوب ہر دو حالت میں پڑھا گیا ہے اس کا ''نکرہ'' ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ایک معمولی سی آواز اتنا بڑا کام کردے گی۔ اگر ''صیحۃ'' پر تنوین تفخیم کی مانی جائے تو پھر معنٰی ہوگا بہت زور کی آواز، کڑک
وَّاحِدَةً: ایک
تاکید ہے ''صیحۃ'' کی
فاذا۔ حرف مفاجات
فَاِذَا هُمۡ: تو فوراً وہ جمع سب کے لیے
هُمۡ جَمِيۡعٌ لَّدَيۡنَا: جملہ اسمیہ ہے ''محضرون'' جس کی خبر ہے
مُحۡضَرُوۡنَ: باب افعال بمعنٰی حاضر کرنا یا حاضر ہونا

سے جگا دیا۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ قیامت کی دہشت، خوف، ہول اور وحشت اس قدر زیادہ ہوگی کہ برزخ کا عذاب نیند اور آرام ہی سے مشابہ محسوس ہوگا۔ ابن جریر، فریابی اور ابن منذر وغیرہم نے فرمایا کہ دوسری مرتبہ صور پھونکے جانے سے تھوڑی دیر پہلے اہل قبور پر ایک نیند طاری کر دی جائے گی۔ اسی نیند کی وجہ سے اہل قبور اپنی قبروں کو مرقد یعنی خوابگاہ تصور کریں گے۔

قارئین کتاب!

منکرین حق جب قبروں سے باہر نکلیں گے، دل دہشت سے کانپ رہے ہوں گے، سر خوف سے چکرا رہا ہوگا اور بدن لرزہ براندام ہوں گے۔ سمجھ نہیں پڑے گا کریں کیا؟ ادھر فرشتے ہانک کر خدا کی کچہری کی طرف لے جا رہے ہوں گے۔ ماحول خود ان پر کھول دے گا کہ یہ تو وہی ہے جو رحمٰن نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور رسول کھول کھول کر یہ وعدہ یاد دلاتے رہے تھے۔ ھذا ما وعد الرحمن وصدق المرسلون ''یہ ہے وہ جس کا وعدہ رحمٰن نے کیا تھا اور رسولوں نے تصدیق کی تھی''۔

اِنۡ كَانَتۡ اِلَّا صَيۡحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمۡ جَمِيۡعٌ لَّدَيۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ ﴿۵۳﴾

''وہ نہ ہوگی مگر ایک زوردار آواز پھر تو اسی وقت وہ سب ہمارے حضور حاضر ہو کر دیئے جائیں گے''۔

وہ لوگ!

جو وقوع قیامت کے بارے میں اضطراب کا شکار ہیں۔ قرآن مجید نہایت موثر پیرایہ میں اور دو ٹوک لب و لہجہ میں وقوع حشر کی ایسی زبردست تصویر کشی کرتا ہے کہ قرآن مجید پڑھنے والا گویا کائنات حقیقت کے پردوں پر نہایت سرعت اور بے تابی کے ساتھ اس فلم کو پھرتا دیکھ لیتا ہے۔ جس سے وہم و تخیل بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوتے معلوم ہونے لگتے ہیں اور ذہن کے لئے قیامت کا عظیم حادثہ ناممکنات سے نہیں رہتا۔

''زوردار آواز'' سے مراد اسرافیل کا دوسری مرتبہ وہ صور پھونکنا ہے جس سے مردہ جسموں میں زندگی نمودار ہونے لگ جائے گی۔ قرآن مجید کا نفیس اسلوب اور ناطق انداز ملاحظہ کیجئے کہ الفاظ کے لہجے میں وہ احتیاط، زور، ابلاغ اور تہور ہے کہ آیہ کریمہ کا ہر جز اور ہر حصہ گویا سوئے ہوئے انسانوں کو جگا رہا ہے۔ ان کی بوسیدہ ہڈیوں میں جیسے یہی الفاظ زندگی کی روح پھونک رہے ہوں۔ بنیادی طور پر یہاں قرآن مجید کا مقصد یہ ہے کہ قارئ کتاب کو معلوم ہو جائے کہ قبروں سے نکلنے، مردہ جسموں میں جان پڑنے اور میدان محشر میں اکٹھا ہونے کے لئے اللہ رب العزت کو کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا پڑے گا۔

بس ایک آواز ہی ہوگی جس کی تیزی اور تاثیر سے یہ سارے کام لمحوں میں ممکن ہو جائیں گے اور سب کے سب انسانوں کو اللہ کے حضور جمع کر دیا جائے گا۔

''صیحۃ'' کا نکرہ کی حالت میں استعمال ''واحدۃ'' کے ساتھ اس کی تاکید اور حسین تعبیر ''اذا'' حرف مفاجات کا استعمال جو عموماً اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں کسی امر کا ناگہانی ہونا بیان کیا جائے۔ ''ھم جمیع لدنیا'' جملہ اسمیہ کی ترکیب اور ''محضرون'' باب افعال کا استعمال سب کے سب اپنے اپنے انداز میں انسانوں کی بے بسی، کم مائیگی اور قیامت کے تیزی کے ساتھ واقع ہونے کی تصویر کشی کر رہے ہیں۔

کتنی روشنی ہے قرآن مجید کے اسلوب میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

کتنا نور ہے کتاب عظیم کے انداز میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

کس قدر ڈھلے ہوئے ہیں قرآنی الفاظ۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

اور کتنی زیبائش ہے کتابی تنبیہات میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

ہر لفظ معنوں کا ایک بحر بے پایاں رکھتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

اور معنی تہہ در تہہ مفہومات کے کتنے خزانے دبائے ہوئے ہے

اور ہر مفہوم انسانی تعمیر کا ایک تازہ جہاں پیدا کر رہا ہے۔

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۴﴾
اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِیْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ﴿۵۵﴾ ج
هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِیْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿۵۶﴾
لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴿۵۷﴾ صلے
سَلٰمٌ قف قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴿۵۸﴾

(پھر کہا جائے گا کہ) آج کسی جان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا اور تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسا تم عمل کرتے رہے ہو (۵۴)
بیشک جنت والے آج ایک شغل میں نشاط حاصل کرنے والے ہوں گے (۵۵)
وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں شہ نشینوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے (۵۶)
ان کے لئے اس میں پھل ہوں گے اور ان کے لئے وہ کچھ ہوگا جو وہ مانگیں گے (۵۷)
ان کے لئے سلام ہے یہ قول ہے اس پروردگار کی طرف سے جو مہربان ہے (۵۸)

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۴﴾

''(پھر کہا جائے گا کہ) آج کسی جان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا اور تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسا تم عمل کرتے رہے ہو''۔

وہ منظر آنکھوں کے سامنے لایئے جب جمیع انسان اپنے رب کے سامنے کھڑے ہوں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ آج کے دن کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا اور تمہیں وہی کچھ ملتا رہے گا جو تم کرتے رہے۔

عربی لغت میں ظلم کہتے ہیں کسی چیز کو اپنی مخصوص جگہ سے ہٹا کر نقصان کے ساتھ یا زیادتی کے ساتھ وقت بدل کر یا جگہ بدل کر دوسری جگہ رکھ دینے کو۔ اسی سے عربی زبان میں محاورہ مشہور ہے ''ظلمت السقا'' یعنی میں نے مشکیزہ کے دودھ کا بے وقت استعمال کیا اسی وجہ سے دودھ کو ''ظلیم'' سے بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ اسی سے ''ظلمت الارض'' کا معنی ہوگا میں نے زمین وہاں سے کھودی جہاں کھودنے کی جگہ نہ تھی۔ ظلم کے اس معنی کی روشنی میں آیہ کریمہ کی معنوی تعبیرات یہ ہوں گی۔

کسی کے اجر وثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

کسی کی سزا میں اضافہ نہ ہوگا۔

کسی ایک کی جگہ کوئی دوسرا نہ پکڑا جائے گا۔

کسی ایک جرم پر کسی دوسرے جرم کی سزا نہ دی جائے گی۔

کسی ایک نیکیوں پر کوئی دوسرا نجات کا دعویٰ نہ کر سکے گا۔

کسی ایک دور کی نیکیوں سے دوسرے دور کے لوگ ناجی ہونے کا مقدمہ متصور نہ کر سکیں گے۔

کسی ایک زمانے کے گناہوں پر کسی دوسرے زمانے کے لوگوں کو سزا نہ دی جائے گی۔

کمال انصاف اور عدل کے ساتھ جزا وسزا کے فیصلے کئے جائیں گے۔

آیۂ کریمہ کے دوسرے حصے ''ولا تجزون الا ما کنتم تعلمون'' میں بیان عدالت کے لئے نہایت سرور آفرین اسلوب اختیار کیا گیا۔

کہا گیا کہ جزا وسزا کا حسابی اور احتسابی نظام تمہارے خارج سے نہیں پھوٹے گا بلکہ تمہارے اپنے ہی اعمال اس کا سرچشمہ ثابت ہوں گے، گویا تمہارے وہ اعمال جو دنیا میں تم سے صادر ہوتے رہے، وہ مجسم صورت میں تمہارے ہم نشین ہوں گے۔ تمہیں تمہارے اپنے اعمال ہی کے سپرد کر دیا جائے گا۔ ظلم تو اس وقت متصور ہوتا کہ اعمال کو نظر انداز کر کے اپنی طرف سے فیصلہ سنا دیا جاتا، کوئی سزا یافتہ اور کوئی جزا یافتہ قرار دے دیا جاتا لیکن کسی کو یہ کہنا کہ تم جو کچھ کرتے رہے اسی کو ہم تمہارا منصف بناتے

مفردات

فَالْيَوْمَ: پس آج کے دن ''یوم'' ظرف ہے

لَا: نہیں

تُظْلَمُ: ظلم کیا جائے گا

نَفْسٌ: جان، روح وغیرہ

نَفْسٌ شَيْـًٔا: کسی جان پر ذرہ برابر

وَّ: اور

حرفِ جر

وَّلَا: اور نہیں

تُجْزَوْنَ: بدلہ دیا جائے گا تمہیں

اِلَّا: مگر، سوائے اس کے

مَا: موصولہ

كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: تم کیا کرتے تھے

مفردات

ہیں اس سے زیادہ عدالت کا تصور اور کیا ہوسکتا ہے۔

اب پڑھئے قرآن مجید کی یہ آیۂ کریمہ اور اسے اس کی بلاغت کے سرور سے جنت گاہ دل بنایئے:

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

مشاہدہ!

رات عشا کی نماز کے بعد تقریباً 50 کے قریب تفاسیر کا مطالعہ کیا۔ زیر تفسیر آیۂ کریمہ ذہن کے پردوں پر گھومنے لگی۔ اس رات عالم خواب میں ایک اجنبی نوجوان کی نعش دیکھی۔ جس کے پاس میں بیٹھ کر اس آیۂ کریمہ کی تلاوت میں مشغول ہوگیا۔ دفعتاً وہ نوجوان زندہ ہوکر مجھ سے ہم کلام ہوا۔ میں نے اس سے پوچھا، دنیا سے رخصت ہوئے تمہارا کتنا زمانہ گزرا؟ اس نے جواب دیا پندرہ سال۔ میں نے پوچھا کہ عالم برزخ میں زندگی کیسی پائی؟ وہ نوجوان کہنے لگا ابھی تک سوال و جواب بھی ختم نہیں ہو نے پائے۔ حیرت زدہ ہوکر میں پوچھنے لگا سوالوں کا وہ طویل سلسلہ کیا ہے کہ ختم ہونے نہیں پارہا؟ اس نوجوان نے کہا کہ زندگی کی ہر گھڑی، ہر لمحہ اور ہر لحظہ سامنے لایا جاتا ہے اور پھر پوچھا جاتا ہے کہ کیا تم نے اس گھڑی میں یہ اور یہ کیا ہے اور پھر ہاں یا نہ میں جواب ثبت کرلیا جاتا ہے۔ ابھی تو نہ جانے زندگی کی کتنی گھڑیاں اور پڑی ہیں جن میں کیا ہوا، خیر و شر سامنے لایا جائے گا۔

صبح اٹھا تو اپنی گزری ہوئی زندگی کا ایک ایک لمحہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگ گیا۔ اعمال کی کچھ زیبا نظر اور کچھ بھیانک تصویریں احتساب کے کٹہرے میں مجسم صورت میں سامنے آنے لگیں۔ گنہگار انسان کے لئے کیا یہ تھوڑی سزا ہے کہ منصف اس کے سامنے لب کشائی سے پہلے یہ تختہ سیاہ نصب کرکے اس کے گناہوں کی تصویریں بناتا چلا جائے اور عمل کرنے والا گناہگار انسان اپنے اعمال کو دیکھ کر کرے بھی تو کیا کرے، سوائے ماتھے سے ندامت کا پسینہ پونچھنے کے اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ بس اللہ کا ارشاد تسلی بھی ہے اور اطمینان بھی، خوف بھی اور ڈر بھی۔

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ

پس آج کے دن تم پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔

وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

اور تمہیں جزا نہیں ملے گی مگر تمہارے اپنے اعمال کی۔

اے میرے پیارے اللہ!

میرے معبود! میرے خدا!

ہم گناہوں کے حصار میں مقید ہیں اسے تو اپنی رحمت اور فضل سے شکستہ فرمادے۔

مفردات

اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ: بے شک جنت والے
جملہ مستانفہ ہے اور ترکیباً مبتدا ہے

الْيَوْمَ: ظرف ہے اور اس پر لام تعریف عہدی ہے

فِيْ: میں

فِيْ شُغُلٍ: ان کی خبر ہے شُغُلٍ شُغْل مصدر ہے۔ اہل کوفہ نے اسے شُغُلٍ شین اور غین کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ مجاہد نے اسے "شُغُلٍ" یعنی شین اور غین کے نصب سے پڑھا ہے نافع اسے "شُغُلٍ" شین کی پیش اور غین کی جزم سے پڑھتے تھے اور بعض "شُغُلٍ" بھی پڑھتے رہے
(اعراب القرآن)

فٰكِهُوْنَ: نشاط حاصل کرنے والے
ان کی خبر ثانی ہے اس لیے مرفوع ہے۔ بعض نے اسے حال سمجھ کر "فاکھین" منصوب بھی پڑھا ہے

هُمْ: وہ

وَاَزْوَاجُهُمْ: اور ان کی بیویاں

فِيْ ظِلٰلٍ: مجموعی لحاظ سے "هم فی ازواجهم فی ظلال الخ" جملہ اسمیہ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ "هم" تو کید ہو اور "ازواجهم" عطف ہو اور "متکئون" نعت ہو "فکھون" کی

عَلَى: اوپر

الْاَرَآئِكِ: تکیے

مُتَّكِـُٔوْنَ: اتکا سے ہے ٹیک لگانے والے

میرے محبوب خدا!
ہماری زندگی لغزشوں کی تاریکیوں میں سسک رہی ہے، تڑپ رہی ہے۔ اسے تو اپنے فضل وکرم کی روشنیوں کا سہارا بخش۔۔۔۔!!

میرے مولا!
اگر ہم اپنے گناہوں کے سبب تجھ سے وہ مانگنے کا حوصلہ نہ پا رہے ہوں جو ہم نہ مانگ سکتے ہوں اور وہ تیرے نزدیک بہتر ہو تو ہمیں وہ بھی عطا فرما۔
آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ اجمعین۔

اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ۚ﴿۵۵﴾ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿۵۶﴾ لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴿۵۷﴾

"بے شک جنت والے آج ایک شغل میں نشاط حاصل کرنے والے ہوں گے۔ وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں شہ نشینوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ ان کے لئے اس میں پھل ہوں گے اران کے لئے وہ کچھ ہوگا جو وہ مانگیں گے"۔

ان آیات کی تفسیر وتشریح میں حافظ ابن کثیر نے خوب لکھا ہے(123):

"جنتی لوگ میدان سے فارغ ہو کر جنت میں بصد اکرام اور بصد تعظیم پہنچائے جائیں گے اور وہاں کی گوناں گوں نعمتوں اور راحتوں میں اس طرح مشغول ہوں گے کہ کسی دوسری جانب نہ توجہ ہوگی اور نہ کسی اور طرف خیال۔ یہ جہنم سے اور جہنم والوں سے بے فکر ہوں گے۔ اپنی لذتوں میں اس قدر سرور ہوں گے کہ ہر چیز سے بے خبری ہوگی نہایت ہشاش بشاش ہوں گے، پاکیزہ حوریں انہیں ملی ہوں گی جن سے وہ لطف اندوز ہوں گے، طرح طرح کے راگ راگنیاں اور خوش آوزیاں دلفریبی سے ان کے دلوں کو لبھا رہی ہوں گی، ان کے ساتھ ہی اس لطف وسرور میں ان کی بیویاں شریک ہوں گی، جنتی سائے میں تختوں پر تکیہ لگائے آرام کر رہے ہوں گے ہر قسم کی خواہش پوری ہوگی"۔

علامہ شیخ اسماعیل حقی تفسیر روح البیان میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اہل بہشت کا شغل دس چیزیں ہوں گی(124):

ملک ایسی ملے گی جس میں معزول ہونے کا تصور نہ ہوگا۔
شباب ایسا ہوگا جس میں بڑھاپے کی ناتوانی نہ ہوگی۔
صحت کی ایسی نعمت ہوگی جس میں بیماری کا نام تک نہ ہوگا۔

عزت وتکریم ایسی ہوگی جس میں ذلت کا شائبہ تک نہ ہوگا۔
راحت وآرام ایسا ہوگا جس میں شدت وتکلیف معدوم ہوگی۔
نعمتیں ایسی ملیں گی جن کے لئے محنت بال برابر بھی نہ ہوگی۔
بقا کی وہ دولت میسر آئے گی جس میں فنا کا تصور بھی نہ ہوگا۔
زندگی وہ دوام رکھے گی کہ موت خود مردہ ہوجائے گی۔
رضا ایسی عطا کی جائے گی کہ غضب کا نام بھی نہ ہوگا۔
محبتیں ایسی غالب ہوں گی کہ وحشت کا نشان تک نہ ہوگا۔
علامہ ثناء اللہ پانی پتی اپنی معروف تفسیر مظہری میں رقم طراز ہیں(125):
''جنت میں سب لوگ اپنے مرغوب کاموں میں مشغول ہوں گے۔صوفیاء کا مقصود چونکہ سوائے ذات باری کے اور کچھ نہیں اس لئے وہ سب اپنے اپنے مرتبوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی تجلیات ذاتیہ کے مشاہدہ میں مستغرق ہوں گے، جب کے دوسرے اہل جنت کے مختلف مشاغل ہوں گے''۔
بایزبسطامی فرمایا کرتے تھے(126):
''اللہ تعالیٰ کے ایسے خاص بندے بھی ہیں کہ اگر انہیں دیدار جمال خداوندی سے روک دیا جائے تو وہ جنت میں اس طرح آہ وفغاں اور فریاد کرنا شروع کردیں جس طرح جہنمی آگ سے نکلنے کے لئے چیخ وپکار کریں گے''۔
حضرت یحیٰ بن معاذ فرماتے ہیں کہ (127):
''میں نے خواب میں اللہ تعالیٰ کے ذاتی انوار کا مشاہدہ کیا درآں حالیکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمارہا تھا کہ اے معاذ! سب لوگ مجھ سے مانگتے ہیں لیکن ایک بایزید ہے کہ وہ محض مجھ سے مجھے ہی مانگتا ہے''۔
حضرت علی کا بھی ایک معروف قول ہے(128):
''اگر میں ایک ساعت کے لئے انوار الٰہیہ کے مشاہدہ سے حجاب میں چلا جاؤں تو مرہی جاؤں''۔
غرض یہ کہ جنت میں سب اہل جنت کے شغل مختلف ہوں گے، لیکن اہل محبت کا سب سے بڑا شغل انوار الٰہیہ کی زیارت ہوگی۔
اہل بہشت کو کن کن نعمتوں سے نوازا جائے گا۔اس سلسلہ میں سنن ابن ماجہ کی ایک روایت ملاحظہ ہو(129):

مفردات

لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ: ان کے لیے اس میں پھل ہوں گے۔خبر مقدم مبتداء مؤخر جملہ معطوفہ ہے
فَاكِهَةٌ: میوہ جو صرف لذت اور سرور کے لیے کھایا جائے نہ کہ غذا کی جگہ استعمال ہو
وَلَهُمْ: اور ان کے لیے جو
مَا: تین قول ہیں:
(ا) موصولہ اسمیہ
(ب) نکرہ موصوفہ
(ج) مصدریہ
يَدَّعُونَ: وہ مانگیں گے
''یدعون'' میں دال ثانی تا سے بدل کر آئی ہے

مفردات

''رسالت مآب ﷺ نے ایک مرتبہ اپنے اصحاب سے پوچھا کیا تم میں سے کوئی جنت میں جانے کا خواہش مند ہے اور اس کے لئے مستعد رہنے والا اور تیاری کرنے والا ہے؟
ایسی جنت جس میں کوئی خوف وخطر نہیں
رب کعبہ کی قسم
جنت تو سراسر نور ہے
اس کی تازگیاں حد سے ماورئی ہیں
اس کے سبزے لہلہا رہے ہیں
اس کے بالا خانے، محکم، بلند اور پختہ ہیں
اس کی نہریں پر اور رواں دواں ہیں
اس کے پھل لذت دار، پکے ہوئے اور بکثرت ہیں
اس کی حوریں خوبصورت اور نوجوان ہیں جو ریشمی لباسوں اور بیش قیمت لبادوں میں ملبوس ہیں
اس کی نعمتیں لازوال اور دائمی ہیں
جنت سلامتی کا گھر ہے
سبز اور تازے پھلوں کا باغ ہے
اس کی نعمتیں بکثرت اور نفیس ہیں
اس کے محل بند اور آراستہ حسن ہیں
صحابہ کرام سن کر کہنے لگے
یارسول اللہ ﷺ ہم سب اس کے لئے تیاریاں کرنے والے ہیں
آپ ﷺ نے فرمایا:
''انشاء اللہ کہو سب صحابہ بولے انشاء اللہ''۔

یہاں یہ جان لینا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ انسان کی دلچسپیاں عام طور پر بدن کے جن اعضاء سے محسوس کی جاتی ہیں۔قرآن مجید نے اہل جنت کے لئے ان سب کا ذکر کیا، مثلاً
انسان آنکھوں سے دلفریب نظارے دیکھنا پسند کرتا ہے قرآن مجید نے ارشاد فرمایا۔۔۔و تلذ الاعین
پیٹ اچھی خوراک اور غذا کی اشتہار رکھتا ہے کتاب ہمہ دان اہل جنت کے لئے اس سے متعلق نعمت کا ذکر کرتی ہے۔۔۔ کلوا واشربوا ھنیا
ہاتھ پسند کرتے ہیں کہ ان میں نعمتیں گردش کرتی رہیں فرقان مجید جنت میں ہاتھ سے تعلق رکھنے

والی نعمت عظیمہ کا تذکرہ کرتا ہے۔۔۔۔یتنازعون فیھا کاسا

پاؤں پسند کرتے ہیں کہ نرم وگداز اور لطیف وجمیل ماحول ان کے نیچے حریر وپرنیاں بچھاتا چلا جائے کلام الٰہی اہل جنت کے لئے اس نعمت کا ذکر یوں کرتا ہے۔۔۔۔ادخلوھا بسلم

نعمتوں سے نشاط حاصل کرنا صرف ہاتھ پاؤں اور پیٹ ہی سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ جنسی دلچسپیاں بھی وجہ سکون ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ کا کلام بلاغت نظام اس کا بھی ذکر کرتا ہے۔۔۔۔حور عین

زبان سے نکلتے ہوئے اچھے کلمات بھی شیرینی اور مٹھاس سے لذت کام میسر کرتے ہیں۔قرآن مجید اس کا ذکر یوں کرتا ہے۔۔واخر دعواھم ان الحمد اللہ رب العالمین

اس طرح کان کے لئے بھی خوش کن نغمے،دلفریب راگ اور سرور آفرین گیت لذت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔اہل جنت کے لئے قرآن مجید کہتا ہے کہ خود خدا اپنی آواز حسن رسا سے اہل بہشت کو متلذذ فرمائے گا۔۔۔

سَلٰمٌ ۚ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴿۵۸﴾

''ان کے لئے سلام ہے یہ قول ہے اس پروردگار کی طرف سے جو مہربان ہے''۔

جنت کی عمومی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد ''سلام قولا من رب رحیم ''کی تفسیر جاننے کے لئے ایک حدیث شریف ملاحظہ ہو(130)۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اہل جنت جب اپنی نعمتوں سے نشاط حاصل کرنے میں مشغول ہوں گے اچانک اُوپر سے ایک نور چمکے گا۔جب وہ سر اٹھا کر دیکھیں گے ،تو انہیں معلوم ہوگا کہ ان کا رب ان کی طرف نور پاشی فرما رہا ہے۔پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے جنت والو! السلام علیکم ''سلام قولا من رب رحیم '' سے مراد یہی ہے۔حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:''اللہ تعالیٰ انہیں دیکھے گا اور وہ اس کے دیدار سے مشرف ہوں گے۔جنت کی کسی دوسری نعمت کا انہیں خیال تک نہ ہوگا''۔

مفردات

سَلٰمٌ: سلام
قَوْلًا: قول
مِّنْ: سے
رَّبٍّ: پروردگار
رَّحِيْمٍ: مہربان

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٥٩﴾

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ
عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٦٠﴾

وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٦١﴾

وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ؕ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٢﴾

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿٦٣﴾

اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿٦٤﴾

اور جدا جدا ہو جاؤ آج اے مجرمو! (۵۹)

کیا میں نے تم سے عہد نہ لیا تھا اے آدم کی اولاد یہ کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے (۶۰)

اور (یہ بھی) کہ بندگی میری ہی کرنا یہی سیدھی راہ ہے (۶۱)

اور اس نے گمراہ کیا تم میں سے ایک خلق کثیر کو، کیا تم سوچتے نہیں تھے (۶۲)

سو یہ ہے وہ جہنم جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا (۶۳)

اپنے کفر کی پاداش میں آج اسی میں داخل ہو جاؤ (۶۴)

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾

''اور جدا جدا ہو جاؤ آج اے مجرمو!''۔

قرآن مجید نے بندگان خدا کے اکرام اور احتشام کے جنتی نقشے کھینچے اور نفسی سکون سے لے کر روحی سرور تک، باطنی لذتوں سے لے کر ظاہری اطمینان تک اور قلبی مسرتوں سے لے کر بدنی راحتوں تک طرح طرح کی نعمتیں گنیں اور زیر نظر آیۂ کریمہ میں جنت میں داخل ہونے کے موقع پر اہل بہشت کو جس اعزاز سے نوازا جائے گا اس کی فرحت فروغ تصویر کشی کی اس طرح کہ ظاہراً خطاب مجرموں سے ہوا اور کہا گیا کہ ''اے مجرمو! الگ ہو جاؤ آج کے دن'' معلوم ہوتا ہے جنتی جب اپنے ''حسن المآب'' کی طرف شاداں وفرحان بڑھیں گے۔ جہنمی حسرتوں کے ساتھ ان کی طرف دیکھیں گے۔ اس موقع پر نہایت حقارت آمیز انداز میں انہیں کہہ دیا جائے گا الگ ہو جاؤ راہ میں یونہی منہ اٹھائے کھڑے نہ ہو(131)۔

غلامان رسول کی بارات جنت میں جا رہی ہے، تمہارے چہرے اس قابل نہیں کہ آج کے دن کسی نیک آدمی کی پاکیزہ نگاہی کا وہ فیض لا سکیں۔ دور ہٹ جاؤ، الگ ہو جاؤ کل تم نے ان سے اپنی فکری اور عملی راہیں جدا کی تھیں آج فطرت خود تمہارے اور ان کے درمیان خط امتیاز کھینچ رہی ہے جسے جو درکار ہوتا ہے وہ مل جاتا ہے۔ تم کل اندھیروں کے دیوانے تھے آج اندھیرے ہی تمہارا مقدر بنیں گے اور یہ درویش کل روشنیوں اور انوار کے متوالے تھے آج روشنیاں اور اُجالے ہی ان کا استقبال کریں گے۔ آج فطرت تمہیں یکجا نہیں ہونے دے گی الگ الگ کر کے چھوڑے گی۔

قرآن مجید کی ایک دوسری مقدس اور نورانی آیت ملاحظہ ہو:

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۫ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴿۲۸﴾

''کیا ہم انہیں جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے ان جیسا کر دیں جو زمین میں فساد پھیلانے والے ہیں یا ہم تقوی داروں کو فاجروں کی طرح قرار دے دیں''(132)۔

وہ لوگ جو آج مومنین کی صفوں میں گھس کر اپنی بدکاریوں پر نیکی کا لبادہ ڈالنے کی مذموم کوشش میں مبتلا ہیں یا وہ دین دار جو دنیا کمانے کے لئے اسلامی شریعت کا نام استعمال کرتے ہوئے تھکتے نہیں، کل وہ ایسا نہ کر سکیں گے، ان کے سارے کچے رنگ اتر جائیں گے اور ان کی حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ روز محشر جہنمی لوگوں سے ان کے معبودوں کو الگ کر دیا جائے گا۔ آیت کا یہ تفسیری مفہوم بعید از فہم بھی نہیں اس لئے کہ انسانی کمزوری ہے کہ جو جن ہستیوں سے محبت رکھتا ہے ان

مفردات

وَ: اور

جلالین نے ''یقول'' نکال کر آیت متلوہ کو جملہ ماسبق پر عطف قرار دیا ہے اور اس طرح تقدیر عبارت یوں ٹھہری:

''ای انفردوا عن المومنین عند اختلاطھم بھم''

امْتَازُوا: فعل امر ہے بمعنٰی الگ ہو جاؤ جدا جدا ہو جاؤ، علیٰحدہ علیٰحدہ ہو جاؤ وغیرہ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا عطف ''ان اصحاب الجنة'' پر ہو

الْيَوْمَ: ظرف بمعنٰی دن

متذکرہ آیت میں ''یوم'' کا لفظ تین بار دہرایا گیا ہے جو تاکید کے لیے ہے

اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ: ''المجرم'' کی جمع ہے گناہ گار اس کا معنٰی ہے ''المجرمون'' میں لام موصولہ ہے بمعنٰی اے گناہ گارو!

کے ساتھ رہنا بھی پسند کرتا ہے خصوصاً وہ محبوب جو بزعم خویش قادر و نافع بھی ہوں، وحشتوں کے وقت بہت یاد آتے ہیں۔ رب کریم نے اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ قیامت کی وقوعی لرزہ خیزیوں میں ان بدبخت منکرین کے خود ساختہ معبود بھی الگ کر دیئے جائیں گے تاکہ انہیں ذرہ بھر اور تھوڑی دیر کے لئے بھی نفسیاتی سکون محسوس نہ ہو(133)۔

عامۃ المفسرین نے لکھا کہ قیامت کے دن تمام مجرموں کو حکم ہوگا کہ وہ الگ الگ صفیں بنالیں، کوئی ایک فرقہ دوسرے فرقے سے مل نہ پائے۔ یہود، عیسائی، آتش پرست، منکرین اور دوسرے مشرکین الگ الگ جمع ہوں۔ گویا مفسرین کے اس گروہ کے نزدیک اس آیت میں قیامت کے دن جمع ہونے کی کیفیت نقل کی گئی ہے(134)۔

ضحاک، ابن جریر، بیہقی اور ابن کثیر وغیرہم سے روایت ہے کہ بروز حشر جب اہل آتش کو آگ میں ڈالا جائے گا تو انہیں الگ الگ لوہے کی صندوقوں میں بند کر دیا جائے گا پھر ان صندوقوں میں لوہے کی کیلیں ٹھونکی جائیں گی اور اس طرح ان سب کو الگ الگ دوزخ کی تہہ میں ڈال دیا جائے گا۔ یہ سب اس لئے ہوگا تاکہ عذاب میں گرفتار شخص سوچے کہ صرف مجھے ہی عذاب دیا جارہا ہے وہ اس قابل نہ ہو کہ دوسرے کا عذاب دیکھ کر نفسیاتی تسلی حاصل کرے۔ تنہائی بذات خود عذاب ہوتی ہے اور پھر تنہائیوں میں بھی آگ اوڑھنا بچھونا بن جائے تو عقوبت کی دشواریاں دوچند ہو جاتی ہیں(135)۔

کس قدر سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
اور کس قدر جان لیوا ہیں قرآن کی تنبیہات
سوائے اللہ کے کوئی اور محمد اور معین نظر نہیں آتا
مایوسیوں کے دبیز اور گہرے دھوئیں میں بس
اسی کی پناہ کی روشنی اُمید جہاں منور کر سکتی ہے۔
اے ہمارے رب!
کل ہمیں اپنے بندوں سے جدا نہ فرمانا
ہماری اُمید کے ستارے تیری عطا اور تیرے فضل ہی کی روشنی ہی سے جگمگا سکتے ہیں۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۰﴾ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾

”کیا میں نے تم سے عہد نہ لیا تھا اے آدم کی اولاد یہ کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے اور یہ بھی کہ بندگی میری ہی کرنا یہی سیدھی راہ ہے“۔

مفردات

اَ: استفہام کیا
لَمْ اَعْهَدْ: میں نے عہد نہ لیا
اِلَيْكُمْ: تم سے، تمہاری طرف
يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ: اے آدم کی اولاد
اَنْ: یہ کہ
لَا: نہ
تَعْبُدُوا: عبادت کرو
الشَّيْطٰنَ: شیطان کی
اِنَّهٗ: بے شک وہ
لَكُمْ: تمہارا
عَدُوٌّ: دشمن
مُّبِيْنٌ: کھلا
وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ: اور یہ کہ میری عبادت کرو
هٰذَا: یہ
صِرَاطٌ: راستہ
مُّسْتَقِيْمٌ: سیدھا

عہد کا صلہ جب "الستی" آئے تو معنی ذمہ دار ٹھہرنا ہوتا ہے (136)۔ رب کریم نے انسانی فطرت میں جو نیک جذبے اور پاکیزہ سوچیں ودیعت فرمائی ہیں ان میں سے اہم ترین اسے ایک جاننا ہے۔ یہ وہ عظیم وظیفہ ہے جس کی وصیت آفرینش آدم سے پہلے ہی ارواح کو کر دی گئی اور اسی کی تاکید مزید ہر دور میں انبیائے کرام فرماتے رہے۔ یاد رہے کہ انسانی عقلوں کے سامنے توحید پرستی کبھی معمہ نہ رہی، کمال سادگی اور پاکیزگی کے ساتھ یہ تعلیم ہر زمانے میں کھل کر انسانوں کے سامنے آتی رہی کہ اللہ سبحانہ واحد اور لاشریک ہے۔ بندگی صرف اسی کے لئے سزاوار ہے، یہی حقیقت ہے جس کی طرف "الم اعھد" کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے (137)۔ اللہ سبحانہ کا یہ سرشت ساز عہد بنیادی طور پر اولاد آدم سے ان دو باتوں پر لیا گیا:

یہ کہ وہ شیطان کی بندگی نہ کریں اس لئے کہ وہ ان کا کھلا ہوا دشمن ہے۔

یہ کہ وہ بندگی صرف اللہ ہی کی کریں اس لئے کہ سیدھا راستہ یہی ہے کہ محض اسی کی عبادت کی جائے۔

قرآن مجید نے تمثیلی انداز میں انسانوں کو زندگی گزارنے کے اہم گر سکھائے گویا کہا دیکھو وہ دیکھو! پردہ حیات پر دو تصویریں نظر آ رہی ہیں: ایک تمہارے جد آدم کی تصویر ہے اور دوسری حریف آدم شیطان کی تصویر ہے۔ آدم پاکباز، معصوم متواضع اور للّٰہیت میں ڈوبے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور شیطان تلا ہوا ہے کہ آدم سے عفت کا صاف رنگ چھین لے اور انہیں معصیت کی ٹیڑھی راہ پر ڈال دے۔ قرآن مجید یہاں اپنے پڑھنے والوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے اے کتاب حکمت کے اجالوں سے نور مند ہونے والو! یاد رکھو تم آدم کی اولاد ہو تمہارا تعلق شیطان سے نہیں، اس لئے تمہیں دشمن کو دشمن سمجھنا چاہیئے اور شیطان کی کوئی بات نہیں ماننی چاہیئے، اگر تم اس کی بات مانو گے تو گویا تم اس کی عبادت کرو گے۔

آیۂ کریمہ میں اطاعت کے لئے عبادت تعبیر لائی گئی ہے جو بذات خود فہم اور ادراک کے کئی دریچے کھول رہی ہے۔ عبادت صرف کسی کے سامنے ماتھا ٹیکنا ہی نہیں ہوتا اور پوجنے کے لئے سر افگنی ہی عبادت نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات اعتقاد کی خرابی سے کسی کی اطاعت کا قلادہ گلے میں ڈال لینا بھی عبادت کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ کتنی خوبصورت بات لکھی امام رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں کہ "اگر تمہارے پاس کوئی شخص آئے اور تمہیں کسی چیز کا حکم دے تو دیکھ لو کہ اس کا حکم اللہ کے حکم کے موافق بھی ہے یا نہیں۔ یاد رکھو کہ اگر اس کا حکم اللہ کے حکم کے موافق نہ ہوا تو پھر شیطان اس شخص کے ساتھ ہے، اگر تم نے ایسے شخص کی بات مان لی تو گویا تم نے ایسے شخص کی اور شیطان کی عبادت کی اس طرح اگر تمہارا نفس تمہیں کسی کام پر برانگیختہ کرے تو دیکھ لو کہ شریعت اس کے بارے میں کیا کہتی ہے اگر شریعت

مفردات

اجازت نہ دے تو تمہارا نفس خود شیطان ہے یا شیطان اس کے ساتھ ہے، اگر تم نے اس حالت میں اس کی پیروی کی تو گویا تم نے اس کی عبادت کی'' (138)۔

امام جعفر صادق ؑ فرمایا کرتے تھے:

من اطاع رجلا فی معصیة فقد عبد (139)

''جس نے کسی شخص کی معصیت میں اطاعت کی گویا اس نے اس کی عبادت کی''۔

شیطان کی عبادت سے منع کرنے کے بعد پروردگار نے نہایت شفقت آمیز انداز میں ارشاد فرمایا ''ان اعبدونی'' عبادت بس میری ہی کرو۔ سیدھی راہ بس یہی ہے۔ پروردگار کی عبادت کا مطلب یہ ہے کہ کائنات بھر کی سرکش قوتوں سے پلہ چھڑا کر اسی کا ہو جانا یہاں تک کہ نفس سے اٹھنے والے مفاد پرستانہ سفلی جذبوں اور آرزوؤں کے خلاف روحانی قوتوں کی پناہ لیتے ہوئے برسر پیکار ہو جانا اور ریاضت، اطاعت، انقیاد، تسلیم اور رضا ہر حوالے سے بندگی کی تصویر بن جانا۔ عبودیت اور عبادت کی کتنی خوبصورت تصویر کشی شیخ اسماعیل حقی نے روح البیان میں فرمائی۔ لکھتے ہیں کہ بندگی کا مفہوم یہ ہے'' کہ انسان اس قدر متواضع ہو جائے کہ اس میں دعویٰ کا نام تک نہ رہے۔ مولا کی محبت میں ڈوبا ہوا ہو، خدا کی طرف سے مقرر کی ہوئی حدود کی حفاظت کرنے والا ہو، اللہ سبحانہ سے اور اس کی مخلوق سے کئے ہوئے وعدوں کی پاسداری کرنے والا ہو۔ امتحانات اور مصائب میں شکوہ کی روش اختیار کرنے والا نہ ہو، خوشیوں کے موقعوں پر معصیت کی راہ پر چلنے والا نہ ہو اور غلامی اور اطاعت میں غافل اور بے خبر نہ ہو'' (140)۔

کتاب حکمت سے موتی چننے والو۔۔۔۔!
کتاب تمہیں سکھلاتی ہے
کتاب عظمت سے خوشہ چینی کرنے والو۔۔۔۔۔!
کتاب تمہیں بتلاتی ہے
کتاب رحمت سے فیض یاب ہونے والو۔۔۔۔۔!
کتاب تمہیں نوازتی ہے
خدا کے خزانوں سے خدا کی باتوں سے اور خدا کے فرمانوں سے
عبادت نہ کرو شیطان کی
بات نہ مانو کسی سرکش مغرور کی
اطاعت نہ بجالاؤ کسی متکبر ابلیس کی

مفردات

فریب میں نہ آؤ عیارنفس کے
اور جال میں نہ پھنسو خواہشات تیرہ وتار کے
یہ سب تمہارے کھلے دشمن ہیں
ان کی بات مانو گے تو یہ تمہیں تمھارے رب سے دور کر دیں گے اس لئے کہ
ان فریبوں میں آنا ہی خدا سے بُعد کی علامت ہے
اس لئے عبادت کرو
ریاضت کرو
اطاعت کرو
نام کی مالا جپو
حسن کے کلمے پڑھو
تسبیحیں کرو اور تہلیلیں
مٹ مٹ کر، ٹوٹ ٹوٹ کر، بجھ بجھ کر
اس پاک ذات کی جو اللہ ہے اور خدا ہے
اور یاد رکھو
عبادت نام ہے
دل کو خالی رکھنے کا
تنہا رہنے کا
اللہ کے لئے، خدا کے لئے
سچے دوست کے لئے، پیارے محبوب کے لئے
حق کے لئے، مولا کے لئے
یہی سیدھی راہ ہے
یہی جادۂ حق ہے
یہ صراط مستقیم ہے
ایسی سیدھی راہ، ایسا سیدھا راستہ، جو منزل تک پہنچاتا ہے
پروردگار ہمارے!
ہمیں بھی سیدھی راہ نصیب فرما جو تجھ تک پہنچانے والی ہو

ایسے کہ تیری عبادت کرتے رہیں
تیری عظمتوں کے گیت گاتے رہیں
جو تجھ سے دور ہوں ان سے بچتے رہیں
اور ہر شیطان، ہر ابلیس اور ہر گندگی کے خلاف برسرپیکار رہیں
اللہ ہماری دعائیں قبول فرمالے اس حسن کے صدقے جس حسن کا تو خود چاہنے والا ہے
مصطفیٰ ﷺ کے وسیلہ سے ہماری معصوم اور اپنے قد سے بڑھی آرزوؤں کو تکمیل کے پیکر عطا فرما۔

اللھم صلی علی محمد وعلی آل محمد کما تحب و ترضی له

وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ؕ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۶۴﴾

''اور اس نے گمراہ کیا تم میں سے ایک خلق کثیر کو کیا تم سوچتے نہیں تھے۔ سو یہ ہے وہ جہنم جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اپنے کفر کی پاداش میں آج اسی میں داخل ہو جاؤ''۔

یہ جملہ بھی اسی گفتگو کا ایک حصہ ہے۔ جو اللہ رب العزت کی طرف سے بروز محشر مجرمین کے ناری گروہ سے کی جائے گی۔ پروردگار فرمائیں گے کہ باوجود اس کے کہ تمہیں سمجھایا گیا تھا کہ عبادت غیر اللہ کی نہ کرنا، خصوصاً شیطان کی دامن گیری سے بچتے رہنا اس لئے کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے، لیکن تم ابلیس کے داؤ میں آ گئے وہ تمہارے گرداگرد حماقتوں کے جال بچھاتا رہا اور اس نے اپنی سفلہ پروریوں، فریب کاریوں اور دسیسہ اندازیوں سے تمہاری عقلوں کو ایسا مجوب کیا کہ ایک خلق کثیر تمہارے اندر میں سے گمراہ ہو گئی۔ کیا تمہیں اتنی تمیز بھی نہ تھی کہ تم دوست دشمن میں امتیاز کرتے۔ تم کن اندھیروں میں جا پڑے تھے کہ عقل رکھنے کے باوجود تم نے اس سے کام نہ لیا۔ تمہیں پیغمبر اور رسول سمجھاتے رہے لیکن تم خود فریبوں کے جہنم میں قصداً جا کودے۔ یاد رکھو! وہ شخص کبھی کامیاب نہیں ہوتا جو دشمن کو دوست سمجھنے پر تلا رہے تم شیطان ازلی مردود کے پناہ خواہ ہوئے جبکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن تھا۔ یہاں تک کہ تم نے اس کی اطاعت اور فرماں برداری کو عبادت کا درجہ دے دیا، سو آج تم اپنی حماقتوں اور خود فریبیوں کے عذاب سے بچ نہیں سکتے۔ میری تنبیہات پر کان نہ دھرنے کا نتیجہ آج یہ ہے کہ جہنم منہ کھولے تمہیں ہڑپ کرنے کے لئے تیار بیٹھی ہے، سو اب ہچکچاؤ نہ، داخل ہو جاؤ اس جہنم میں جو تمہارے کفر کا منطقی نتیجہ ہے۔ اب لپٹ جاؤ اس آگ سے جیسے کہ تم بلائیں لیتے تھے دنیا میں احمق شیطان دوستوں سے۔ اب پیچھے نہ ہٹو اس آگ سے جو تمہاری خود فریبی اور کفر مستی ہی نے روشن کی ہے اور یہی وہ وعدے ہیں جو ہمارے نیک بندے اور رسول تمہیں وقتاً فوقتاً یاد دلاتے رہے ہیں۔

مفردات

وَلَقَدْ: اور بے شک
اَضَلَّ: اس نے گمراہ کیا
مِنْكُمْ: تم میں سے
جِبِلًّا: ھذیل اسے ''جبلا جیم'' کی ضمہ اور با کے سکون کے ساتھ پڑھتے تھے۔ حمزہ اور کسائی ''جبلا'' جیم اور با دونوں پر ضمہ اور لام کو مخفف پڑھتے تھے۔ اسحاق، زہری اور حفص ''ج، ب، لام'' جیم اور با کو اور لام کو مشدد پڑھتے تھے۔ اشہب، عقیلی، یمانی، عاصم اور اعمش جیم اور با کی کسرہ اور لام کی تخفیف سے پڑھتے تھے۔ حضرت علی ؓ سے اس لفظ کی قرأت ''جیلا'' ب کی جگہ ی سے بھی مروی ہے۔ (روح المعانی)
''جبل'' بڑی جماعت۔ (راغب)
ضحاک کہتے ہیں کہ ایسی جماعت جس کی تعداد دس ہزار تک پہنچتی ہو۔
(روح المعانی، التحریر، ابن عاشور)
كَثِيْرًا: بہت سے
اَفَلَمْ: استفہام انکاری ''کیا نہیں''
اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا: کیا تم نہیں رکھتے، کیا تم نہیں تھے، کیا تم نہیں
تَعْقِلُوْنَ: عقل رکھتے
هٰذِهٖ: اسم اشارہ بمعنی یہ
جَهَنَّمُ: دوزخ
الَّتِيْ: اسم موصولہ برائے ''وہ جو''
كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ: جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا
اِصْلَوْهَا: مل جاؤ اس سے
الْيَوْمَ: آج
بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ: بسبب اس کے کہ تم کفر کرتے تھے

قرآن پڑھنے والو!
تاریخ کے اوراق کو ذرا پلٹ کر پڑھو
مخلوق کثیر آج گمراہ کیوں ہوئی؟
صرف اس لئے
کہ وہ دوستی کے تقدس کو بھانپ نہ سکی
دشمنوں کو بھی دوست سمجھتی رہی اور دوستوں کو بھی دوست جان نہ سکی
یہ خود فریبی تھی
کہ شیطان کو انہوں نے اپنے اوپر مسلط کر لیا تھا
عقل رکھتے تھے لیکن عقل استعمال کرتے نہ تھے
پس قاری قرآن!
تو عقل مند ہو جا اور دوستی احتیاط سے رکھ
حریفوں کی کڑی نگرانی کر اور ان کی چالوں میں نہ آ۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٦٥﴾

وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴿٦٦﴾

وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٦٧﴾

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ؕ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٦٨﴾

اس دن ہم مہر لگا دیں گے ان کے مونہوں پر اور بولیں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پاؤں اس پر جو وہ کمایا کرتے تھے (٦٥)

اور اگر ہم چاہتے تو مٹا دیتے ان کی آنکھوں کے نشان تک پھر وہ راستہ کی طرف دوڑتے تو انہیں کچھ سجھائی نہ دیتا (٦٦)

اور اگر ہم چاہتے تو انہیں مسخ کر کے رکھ دیتے اپنی جگہوں پر اس طرح کہ نہ ان کی طاقت میں ہوتا کہ آگے بڑھ سکیں اور نہ ان سے یہ ہوتا کہ پیچھے پلٹ سکیں (٦٧)

اور جسے ہم لمبی عمر دیتے ہیں اسے خِلقت میں الٹا دیتے ہیں ہم تو کیا یہ نہیں سمجھتے ؟ (٦٨)

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٦٥﴾

''اس دن ہم مہر لگا دیں گے ان کے مونہوں پر اور بولیں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پاؤں اس پر جو وہ کمایا کرتے تھے''۔

آج کے زندہ انسان کو قرآن مجید کے اس حصہ میں کل کے بے بس انسان کی تصویر بتائی جارہی ہے۔ وہ دن جب انسان کا کچھ بھی اپنا نہ ہوگا۔ اعمال میزان عدل میں تل رہے ہوں گے اور احتساب کی گرفت اس قدر شدید ہوگی کہ وجود کے اعضاء بھی گویا دماغ کے زیر اثر نہیں رہیں گے۔ اعمال کے آثار کی طرح وجود کے اعضاء منتشر ہو کر اللہ کے سامنے عجز کا اظہار کر رہے ہوں گے اور ہر عضو اور ہر حصہ اپنے اندر چھپائی ہوئی محفوظ شہادتیں امانت سمجھ کر اُگل دے گا۔ انسانی اجسام کے گونگے اعضاء بھی ابن آدم کی کارستانیوں کی سرگزشت سنا رہے ہوں گے (141)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم رسالت مآب ﷺ کے پاس موجود تھے کہ آپ اچانک ہنسنے لگ گئے، یہاں تک کہ آپ کے دندان مبارک دکھائی دینے لگ گئے آپ ﷺ ارشاد فرمانے لگے کہ کیا تم لوگ جانتے ہو کہ میں کیوں ہنسا؟ ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی خوب جانتے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ''میرے ہنسنے کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کا دن ہوگا اور بندہ اپنے رب سے مجادلہ کرے گا۔ کہے گا اے پروردگار! تو نے مجھے ظلم سے نجات دی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ہاں میں نے تجھے ظلم سے نجات دی۔ اس پر بندہ عرض کرے گا کہ آج کے دن میں اپنے اُوپر سوائے اپنی ذات کے کسی کو گواہ تسلیم نہیں کرتا۔ پس حکم ہوگا پھر تیرا نفس ہی حساب لینے والا کافی ہے اور کرامت والے فرشتے کافی گواہ ہیں پھر اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور اس کے اعضاء اس کے اعمال کھولنے لگ جائیں گے''۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری کی ایک حدیث کے مطابق گواہیاں لینے کا یہ انداز منافقین اور مشرکین کے ساتھ خاص ہوگا۔ رہ گیا معاملہ مومنین کا تو وہ ہر گناہ کا اقرار کرتے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو بخش کر مستور کرتا جائے گا (142)۔

مشرکین اور مجرمین سے احتساب کا یہ انداز ممکن ہے اس لئے ہو کہ ان میں سے بعض ہیکڑ اور ضدی محشر کو دنیا کی عدالت سمجھتے ہوئے حقائق سے منہ موڑنے کی کوشش کریں، جس پر ان کے جسموں کے اعضاء کو حکم ہو اور وہ گواہی دینا شروع کر دیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی رسوائی اور ذلت کے لئے

مفردات

اَلْيَوْمَ: جملہ مستانفہ ہے ظرف متعلق بہ نختم
دن بنیادی طور پر اس کا معنٰی چھپانا اور ڈھانکنا ہوتا ہے (المفردات، لسان، تاج)

نَخْتِمُ: ختم سے ہے
فعل مضارع جمع متکلم
از باب ''ضرب یضرب'' مہر لگانا
ابن فارس نے لکھا ختم اور طبع ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں۔ بعد میں اس لفظ کے معنوں میں وسعت پیدا ہوئی اور یہ بند کر دینے اور روکنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہونے لگ گیا

عَلٰٓى: استعلاً کے معنی میں استعمال ہوا۔ اوپر یا پر

اَفْوَاهِهِمْ: ان کے مونہوں پر

تُكَلِّمُنَآ: ہم سے بات کریں گے

اَيْدِيْهِمْ: ان کے ہاتھ

وَتَشْهَدُ: اور گواہی دیں گے

اَرْجُلُهُمْ: ان کے پاؤں

بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ: وہ جو کمایا کرتے تھے
''یکسبون'' کسب سے ہے جس کا بنیادی معنٰی جمع کرنا ہوتا ہے۔ کسی چیز کے حاصل کرنے کو بھی کسب سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ قرآن مجید میں بعض مقامات پر یہ لفظ تلاش معاش کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے اور مطلق کسی چیز کا پا لینا بھی کسب کے مفہوم میں شامل ہوتا ہے

مفردات

صرف اسی پر اکتفانہ کیا جائے کہ فرد جرم عائد ہو بلکہ ان کا کیا ہوا عملاً محشر والوں پر کھول دیا جائے گا تا کہ وہ بھی دیکھ لیں کہ کس قدر غلیظ لوگ تھے۔ ماوردی کے نزدیک اعضاء کی گواہی زبان کی نسبت زیادہ بلیغ ہوتی ہے اس لئے عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے یہ انداز اختیار کیا جائے گا(143)۔

اعضاء کے بولنے کی کیفیت کیا ہوگی؟

اس سلسلہ میں مفسرین کی آراء مختلف ہیں(144): بعض کے نزدیک انسانی اعضاء کو قیامت کے دن ادراک اور شعور کی پوری قوتیں عطا کر دی جائیں گی اور وہ شعوری گواہیاں قائم کر دیں گے۔ بعض کے نزدیک اللہ تعالیٰ انہیں صرف وقتی طور پر حقائق بے نقاب کرنے کی قوت عطا فرمائیں گے اور بعض کے نزدیک اعضاء میں جو اعمال کے آثار ہوں گے انہیں ظاہر کر کے گواہیاں قائم کی جائیں گی۔ ہمارے نزدیک ان تینوں صورتوں میں سے کوئی بھی صورت ناممکن ہے۔ اعمال کو محفوظ کرنے کے لئے عصر جدید میں ویڈیو اگر کارگر ثابت ہوسکتا ہے تو اعضاء کا قیامت کے دن سرگزشت سنا دینا ناممکن الوقوع نہیں رہتا۔ اقوال اگر ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے صدیوں بعد بھی سنے جاسکتے ہیں تو کیا بعید ہے کہ روز محشر اسی قسم کے کسی نظام کے تحت ہاتھ پاؤں چلائے اور بال تک بول اٹھیں کہ ہم نے یہ اور یہ کیا ہے۔

آیت ہمیں بتاتی ہے کہ اے انسان! جس بدن کی راحت اور سکون کے لئے تو اپنے محسن آقا کے آستانہ سے بھگوڑا ہو رہا ہے، اس بدن کا کوئی جز اور کوئی حصہ تیرا اپنا نہیں۔ یہ کل اپنے حقیقی مالک کے سامنے جب سرفگندہ ہوں کے ان کی گواہیاں تیرے خلاف ہوں گی، جس بدن سے تو شہ زوریاں دکھاتا ہے، جن ہاتھوں سے تو اپنے قوی ہونے کے مظاہرے کرتا ہے، جن آنکھوں سے تو اللہ کے سامنے بھی دیدہ دلیریوں سے شرماتا نہیں ہے۔ کل یہ سب تیرے خلاف ہوں گے، آج کے یہ گونگے کل کے بولنے والے ہوں گے، آج کے یہ اندھے کل کے دیکھنے والے ہوں گے۔ ان کی ناطق اور بابصیرت تنبیہات سے عبرت حاصل کر۔

ایک نکتہ ذہن میں رہے کہ آیت میں ہاتھوں کی طرف بات کرنا اور پاؤں کی طرف گواہی دینا منسوب کیا گیا ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اعمال عام طور پر ہاتھوں سے سرزد ہوتے ہیں پاؤں محض حاضر رہتے ہیں جو کرتا ہے وہ اقبال جرم کرے گا جو حاضر دیکھتا ہے وہ گواہی دے گا(145)۔

قیامت کے دن اعضاء کی گواہی کے ضمن میں اس آیت کے علاوہ قرآن مجید کے دو اور محل ملاحظہ ہوں سورہ نور میں ارشاد رب العزت ہے:

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٤﴾ (نور:24)

سورہ حم سجدہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

(حم السجدہ:20)

مذکورہ آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ہاتھ اور پاؤں ہی گواہی نہیں دیں گے بلکہ آنکھیں، کان، جلدیں اور زبانیں بھی ہوا کیا کھولیں گی، البتہ یہاں ایک اشکال وارد ہوتا ہے کہ سورہ یٰسٓ کی اس آیت میں مونہوں ہر مہر لگانے کا ذکر ہے اور سورہ نور میں زبانوں کی گواہی دینے کا تذکرہ ہے ان دو باتوں میں تطبیق کی صورت یہ ہوگی کہ ممکن ہے کہ پہلے مونہوں پر مہر لگا دی جائے اور اعضاء کو حکم ہو کہ وہ بولیں اور انسان کا وجود سب کچھ انڈیلنے لگ جائے تو زبانوں کو بھی اذن مل جائے گا کہ وہ اقبال جرم کر لیں (146) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مونہوں پر مہر لگانے سے مراد اختیار کلام سلب کر دینا ہے (147) یعنی اپنی زبانوں سے اپنی مرضی کی گفتگو نہ کر سکیں گے بلکہ جو سچ اور حق ہوگا وہی ان کی زبانوں سے نکلے گا اور بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ منہ پر مہر لگانے سے مراد یہ ہے کہ وہ کوئی ایسا نافع کلام نہ کر سکیں گے جس سے ان کی اپنی ذات کے بارے میں نظام عدل مجروح ہو (148)۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ۝

وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ۝

"اور اگر ہم چاہتے تو مٹا دیتے ان کی آنکھوں کے نشان تک پھر وہ راستہ کی طرف دوڑتے تو انہیں کچھ سجھائی نہ دیتا اور اگر ہم چاہتے تو انہیں مسخ کر کے رکھ دیتے اپنی جگہوں پر اس طرح کہ نہ ان کی طاقت میں ہوتا کہ آگے بڑھ سکیں اور نہ ان سے یہ ہوتا کہ پیچھے پلٹ سکیں"۔

آخرت میں احتساب کی شدتیں جتنی بھی تلخ ہوں سوال یہ ہے کہ "عمر رواں" میں بھی کسی پر مرحلہ پر کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ذات کبریا اپنی مشیت کے قانون کو حرکت دے دے اور خود مستیوں کے نشے سے سرشار اور خود فریبیوں کے خمار میں مبتلا لوگ خدا کی گرفت میں آ جائیں۔ اس سوال کا جواب "ولو نشاء" سے دیا جا رہا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو دنیا ہی میں مکذبین کو دردناک عذاب میں مبتلا کر دیں اور اس طرح کہ انہیں وحشتوں اور اضطرابات کی کالی اور گھنگھور گھٹائیں ہر سمت سے گھیر لیں۔ وہ سوچتے کیوں نہیں کہ ایک آنکھوں ہی کو اگر ہم ملیا میٹ کر دیں تو منزل تک پہنچانے والی ہر راہ سے وہ محروم ہو جائیں، وہ دیکھنا چاہیں بھی تو نہ دیکھ سکیں، وہ کہیں بڑھنے کا ارادہ کریں بھی تو ہدایت کے اُجالے معدوم ہو جائیں۔ قبل اس کے کہ فضل خدا کے ماہتاب کی دودھیا اور نورانی روشنیاں اپنا رخ کسی اور جانب پھیر لیں۔

مفردات

وَلَوْ نَشَآءُ: اور اگر ہم چاہیں
لو شرطیہ۔ جملہ میں مشیت مفعول محذوف ہے تقدیر عبارت یوں تھی:
"لو نشاء طمسها لفعلنا"
(صاوی الجلالین)

لَطَمَسْنَا: تو ہم مٹا دیں "طمس" باب ضرب یضرب اور نصر دونوں میں مستعمل ہے۔ اہل لغت کے نزدیک مطموس وہ اندھا ہوتا ہے جس کی دونوں آنکھوں کے درمیان شق نہ ہو (کشاف)
کسی چیز کو اس طرح مٹانا کہ اس کا اثر ہی نہ رہے
(تاج، مجمع البیان، روح المعانی)

عَلٰٓى: اوپر

اَعْيُنِهِمْ: ان کی آنکھیں

فَاسْتَبَقُوا: تو دوڑ پڑیں

الصِّرَاطَ: راستہ

فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ: یہاں صراط سے پہلے حرف جار "الیٰ" محذوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے: فاستبقوا الی صراط اور یہ عطف ہے "لطمسنا" پر
(نسفی، فی مدارک)

فَاَنّٰى: فا سببیہ ہے اور استفہام انکاری کے لیے ہے بمعنیٰ "تو کہاں"

يُبْصِرُوْنَ: دیکھیں گے

مفردات

وَلَوْ: اور اگر
نَشَآءُ: چاہیں ہم
لَمَسَخۡنٰهُمۡ: شکل کا اس طرح تبدیل کر دینا کہ پتھر یا جماد یا جانور کی صورت بن جائے
عَلٰى: پر
مَكَانَتِهِمۡ: حسن، سلمی، زر بن حبیش اور عامر اسے مکانات جمع کے صیغے سے پڑھتے تھے۔ ان کے علاوہ قرأ کے نزدیک واحد مستعمل ہے۔ (قرطبی) مکنات بھی اس کی ایک قرأت ہے (نحاس۔اعراب القرآن)
فَمَا اسۡتَطَاعُوۡا: ان کی طاقت میں نہ ہونا
مُضِيًّا: اصل میں "مضوی" تھا۔ واؤ ساکن جب یا کے ساتھ جمع ہوئی تو اسے قاعدہ کے مطابق یا سے تبدیل کر دیا گیا اور پھر یا کو یا میں مدغم کر دیا گیا اور ضاد کا ضمہ یا کی مناسبت سے کسرہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ ابو حیوۃ نے اسے میم کی فتح سے بھی پڑھا ہے (قرطبی)
زمخشری نے لکھا کہ یہ تین حرکتوں سے مستعمل ہے
وَلَا: اور نہیں بمعنی آگے بڑھنا
يَرۡجِعُوۡنَ: پیچھے پلٹنے کی

قرآن پڑھنے والو!

غور و فکر کر لو، اس اندھے کی حالت پر جو کسی چوراہے میں بے بس کھڑا ہو۔ وہ لب سڑک پہنچنا چاہتا ہو لیکن نہ تو تیز رفتار گاڑیاں اسے موقع دیں، نہ نظر ہی سہارا بنے اور نہ ہی کوئی ایسا ہادی ہو جو انگلی پکڑ کر سڑک کے کنارے چھوڑ آئے۔ قرآن مجید "فانی یبصرون" ایسے ہی منظر کی عکاسی کر رہا ہے اور الہامی تنبیہات انسانوں کو جھنجھوڑ کر سمجھا رہی ہیں کہ لوگو! اللہ کی رحمتوں بھری رہنمائی کا بھی ایک خاص وقت ہوتا ہے اور صلاحیتوں اور اہلیتوں کو کام میں لانے کی بھی ایک فرصت ہوتی ہے، جب وقت گزر جائے تو تلاش کرنے سے بھی منزلوں کے سراغ نہیں ملا کرتے۔ قرآن مجید ہمیں سکھلاتا ہے کہ نور نبوت سے آنکھیں موند لینے والو! کہیں ایسے نہ ہو کہ تم اس نور حق کے سامنے گستاخی سے آنکھیں موندلو اور برق جلال حق تمہیں دیکھنے کی صلاحیت ہی سے محروم کر دے اور تمہاری دیکھنے والی آنکھوں کے نشان تک نہ رہیں اور تم مادر زاد اندھوں کی طرح ہو جاؤ۔ بچو! فطرت کی اس کڑک دار بجلی سے جو راہوں کو روشن کرنے پر بھی قادر ہے اور آنکھوں کی جھلیوں سے فیض چھیننے پر بھی قدرت رکھتی ہے۔ اب بھی وقت ہے سدھرنے کا، اب بھی موقع ہے سنورنے کا، کھلی آنکھوں سے دیکھو اگر بڑے بڑے نہیں بچ سکے تو تم کیسے بچ سکو گے، نظریں اور آنکھیں اس لئے نہیں ہوتیں کہ تم اچھی چیزوں کو بھی بدنگاہیوں کا شکار بنالو بلکہ یہ اللہ کا نور ہوتا ہے۔ یہ بروں پر بھی پڑے تو اس کا عکس نور ہی رہنا چاہئے، صرف اتنا ہی نہیں کہ خدا محض آنکھیں لینے پر ہی قادر ہے، وہ چاہے تو خوبصورت انسانی جسموں کو مسخ ہی کر دے، تخلیق ہی بدل ڈالے، خوبصورت انسانی قالب کی جگہ جانوروں کی کریہہ صورت بنا دے، ٹانگیں لے لے اور جسم پر فالج طاری کر دے، متحرک جسم کو جامد پتھر اور ساکت بت بنا دے، نہ آگے حرکت ہو سکے نہ پیچھے پلٹا جا سکے، نہ سوچا جا سکے، نہ دیکھا جا سکے، بساطیں الٹ جائیں اور تدبیریں بکھر جائیں۔

غور کرو صرف مسخ ہی نہیں بلکہ تم میں سے اگر کوئی معصیت اور نافرمانی میں مبتلا ہو اور کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کر رہا ہو اور عین اسی وقت تمہارا جسم مسخ ہو جائے اسی حالت میں بفرض محال تم موت ہی کے پنجہ میں گرفتار ہو جاؤ تو بتاؤ تمہاری پارسائیوں کے بھرم کا کیا بنے گا۔ اگر تم یہ پسند نہیں کرتے تو وقت کو غنیمت جانو اور اللہ کی طرف سے دی گئی مہلت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو اور بیدار ہو جاؤ اور راہ راست کی طرف لوٹ آؤ (149)۔

بعض مفسرین نے ان دونوں آیات کو عذاب آخرت ہی سے متعلق مربوط کیا ہے (150)۔ ان کے خیال میں یہ اس منظر کی عکاسی ہے جب لوگ پل صراط سے گزر رہے ہوں گے کچھ تو سعادت کی راہوں پر چلنے کی برکت سے چشم زدن میں فائز المرام ہو جائیں گے اور کچھ بے روح مجسموں کی طرح

حیران و پریشان ہو جائیں گے۔ اندھوں کی طرح پل صراط پر چڑھیں گے لیکن اُوپر نیچے گرتے جائیں گے، نہ آگے بڑھنے کا حوصلہ ہوگا نہ پیچھے پلٹنے کی اجازت، نہ کوئی یار اور نہ مددگار۔

قرآن پڑھنے والو!

اب تم خود فیصلہ کرلو کہ تمہیں کون سا گروہ پسند ہے۔

مولا!

پردہ پوشی فرما

اپنے عذاب کی کڑک سے محفوظ رکھ

ہماری معصیت کو نہ دیکھ اپنے دامن رحمت پر نظر رکھ

اور رحمت ہی کا فیضان ارزاں فرما آمین

اللھم صل علی محمد و علی اله محمد و بارك و سلم و صل علیه

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ؕ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۸﴾

''اور جسے ہم لمبی عمر دیتے ہیں اسے خِلقت میں الٹا دیتے ہیں ہم تو کیا یہ نہیں سمجھتے''؟

اس آیت میں ہم ''افلا یعقلون'' سے گفتگو شروع کریں گے اس لئے کہ آیت کا تفسیری عمود انسانوں کی فکری قوتوں کو بیدار کرنا ہے۔ یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ وہ عقل سے دور اور بعید امور کو بھی زندگی کی جولانگاہ سے مشاہدہ کرنے والی آنکھوں سے اس قدر قریب کر دیتا ہے کہ انسانی تجربے خود بول بول کر دماغوں کی اعتقادی اور ایمانی رفتار میں اس قدر سرعت پیدا کر دیتے ہیں کہ ''غیوب و شہود'' سب برابر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

یاد رہے کہ زیر نظر آیت مقدسہ میں عقل کے لئے فکری مواد خارج سے نہیں مہیا کیا گیا ہے بلکہ خود عقل پر ہی پیش آنیوالے مد و جزر کو دیکھنے والی آنکھ کے لئے مشاہدہ گاہ اور سوچنے والے دماغ کے لئے ذریعہ عبرت بنا دیا گیا ہے اور بذات خود عقل کی قیادت میں چلنے والے جسم میں جو آئے روز تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، انہیں تماشا گاہ قلب و نظر بنا کر لوح ایمان پر ایک زبردست انقلاب پرور شکن اور روح انگیز دعوت بکھیر دی گئی ہے۔

''نکس'' اور ''تنکیس'' کسی چیز کو الٹا دینے کے مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں (151) ''انتکس'' کا مفہوم ہوتا ہے کہ فلاں شخص اپنے سر کے بل گر پڑا، گویا سر پاؤں کی جگہ اور پاؤں سر کی جگہ چلے گئے۔

اب غور کیجئے!

قرآنی دعوت میں کہ اللہ رب العزت انسانوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرماتے ہیں: کہ جس شخص کو

مفردات

وَمَنْ: اور جسے

نُّعَمِّرْهُ: ہم لمبی عمر دیتے ہیں

''العمارہ'' خراب کی ضد ہے۔ آباد رہنا اس کا وضعی معنٰی ہے۔ ''عمر'' بدن کا زندگی کے ساتھ آباد رہنا ہوتا ہے۔ باب تفعیل میں آ کر دراز اور لمبی عمر کے لیے استعمال ہوتا ہے

نُنَكِّسْهُ: اسے خلقت میں ہم الٹا دیتے ہیں

''نکس'' کسی چیز کو الٹا دینا۔ ''المنکس'' وہ گھوڑا ہوتا ہے جو چلتے وقت کمزوری سے سر اور گردن جھکا کر چلے۔ ''ننکس'' بہت زیادہ کمزور ہونا اور بڑھاپے کی حالت میں پڑ جانا ہوتا ہے

فِي الْخَلْقِ: خلقت میں

اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ: تو کیا یہ سمجھتے نہیں

مفردات

ہم لمبی عمر سے نوازتے ہیں، اسے خلقت کے اعتبار سے بالکل پلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ کیا ان کے سوچنے کے لئے یہ کافی مواد نہیں ہے؟ تخلیق میں پلٹ دینے کا مشاہدہ کرنے کے لئے ضروری نہیں کہ آپ ذکی الذہن ہوں اور آپ کے پاس کافی علم موجود ہو بس صرف اتنا کرلیں کہ اپنا بچپن، جوانی اور بڑھاپا دیکھ لیں اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اپنی نظروں کے سامنے ایک معصوم بچہ، ایک سجیلا نوجوان اور ایک پیر عمر یافتہ لے آئیں اور پھر زندگی کے مرکز پر گھومنے والے ان ادوار کا مشاہدہ دردمندی سے کرتے جائیں۔۔۔۔!!

انسانی تخلیق کا آغاز سفر نہایت معصومیت سے ہوتا ہے۔ بدن جیسے چاندی سے ڈھلا ہو، حرکتیں جیسے نسیم صبح دھیرے دھیرے شب دیجور کا کلیجہ چیر کر گزر جائے، اشارے جیسے ستارے فلک نیلگوں کی گود میں کھیل رہے ہوں، آواز جیسے کوئی آبشار نغمے گنگنا رہی ہو، عصمت جیسے شبنم نے چپکے سے کسی پھول کو غسل دے دیا ہو، نظریں جیسے کوئی فرشتہ جنت سے جھانک رہا ہو، چہرہ جیسے کوئی کنول دریا کی لہروں پر خود مست تیر رہا ہو، عمر لطیف کی ان گھڑیوں میں جیسے جنت خود گہوارہ بنی ہو۔ بچہ تکامل اور ارتقا کے مرحلوں سے گزر رہا ہوتا ہے پھر دیکھتے ہی دیکھتے شباب اور جوانی کی بہاریں امڈ پڑتی ہیں۔ عقل تازہ، جذبے جواں، امنگیں رواں دواں، آرزوئیں مست، نگاہیں برق وبجلی، بدن سنگ وآہن، عزم چرخ وآسماں، ہمت بلند وبالا، لحظے رنگین ورعنا، گھڑیاں مست ولیلی، حرکت زلزلہ، آواز قیامت پھر اس کو بھی پائیداری نصیب نہیں۔ پرکار فطرت کی ایک جنبش سے بڑھاپا آ کھڑا ہوتا ہے۔ زندگی کچھ ایسے الٹ پلٹ ہو جاتی ہے جیسے آسمان زمین بن جائے اور زمین آسمان ہو جائے، عقل ہے تو روبہ تنزل، جسم ہے تو روبہ شکست، ضعف اور ناتوانی ایسی جیسے کسی نے بچپنے کو بلا لیا ہو۔ چلنا چاہو تو چل نہیں سکتے، بولنا چاہو تو بول نہیں سکے اور سوچنا چاہو تو سوچ نہیں سکتے۔ طاقت اور جسم کے فاصلے گھٹنے لگ جاتے ہیں اور جسم اور روح کے فاصلے بڑھنے لگ جاتے ہیں۔ حرکتیں بچوں ایسی، فیصلے بچوں جیسے، فرق ہے تو صرف اتنا کہ ہر طفلانہ حرکت کو محبت اور لاڈ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور بوڑھوں کی ہر بے بسی کی حرکت کو حماقت سمجھ کر ٹھٹھوں کا مرکز بنا لیا جاتا ہے۔ افراد کی طرح قومیں بھی جب سیدھا راستہ چھوڑ دیتی ہیں تو انہیں اوندھا کر کے رکھ دیا جاتا ہے(152)۔

قاری کتاب!

انسانی زندگی کے یہ زبردست اور عقل فروغ انقلابات کیا اتنی سی بات بھی تمہیں نہیں سمجھا سکتے کہ جو رب ان ناممکنات کو ممکن بنانے پر قادر ہے۔ اس سے کچھ بعید نہیں کہ وہ بروز قیامت تمہاری بوسیدہ ہڈیوں میں جان ڈال دے اور پھر اپنی دی گئی ایک ایک امانت کا حساب لے لے۔ وہ لوگ جو دنیا ہی میں عذاب دیکھنے کے خواہشمند ہیں، انہیں بڑھاپے کی اسارت اور ناتوانیوں پر گہری نظر ڈالنی چاہئے اور ہدایت قبول کرنے میں آج اور کل کرتے رہنے کی سستیوں کا جامہ اتار پھینکنا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو

کہ زندگی قلابازیاں کھانے لگ جائے اور انسان زمین میں خدا کا قیدی بن جائے۔ضرورت ہے عقل سے کام لینے کی، کیا خوب فرمایا رسول اللہﷺ نے لوگو! پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو:

جوانی کو بڑھاپے سے پہلے

تندرستی کو بیماری سے پہلے

غنا کو فقر سے پہلے

فراغت کو مشغول ہونے سے پہلے

اور زندگی کو موت سے پہلے (153)۔

میرے مولا۔۔۔۔۔!

میرے رب۔۔۔۔۔!

تجھے تیری قدرتوں کا واسطہ

بارالٰہا۔۔۔۔۔!

مشکل کشا۔۔۔۔۔!

احتیاج کے دھکوں سے محفوظ رکھنا

وہ وقت نہ آئے کہ اپنے بھی بیگانے ہو جائیں

اولادیں آنکھیں چرائیں اور معاشرہ ٹھٹھہ بنالے

جوانی ہو یا بڑھاپا

''بس تو ہو تیری یاد ہو''

اللھم صلی علی محمد و علی آل محمد کما تحب و ترضٰی لہ

✡✡✡✡✡

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿٦٩﴾ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٧٠﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿٧١﴾ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴿٧٢﴾ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٧٣﴾

اور نہیں سکھائی ہم نے انہیں شاعری اور نہ ہی یہ ان کی شان کے لائق ہے، یہ تو نہیں بس مگر بصیرت افروز حقیقتیں اور محکم قرآنی باتیں (٦٩)

تا کہ وہ خبردار کریں اسے جو زندہ ہو اور قائم ہو جائے حجت انکار کرنے والوں پر (٧٠)

کیا وہ یہ نہ دیکھ پائے کہ ہم نے پیدا کیا ان کے لئے اپنے ہاتھوں کے عمل سے مویشیوں کو اور اب یہ ان کے مالک ہیں (٧١)

اور ہم نے انہیں ان کے تابع کر دیا تو ان میں سے کچھ پر وہ سواری کرتے ہیں اور بعض کو ان میں سے وہ کھاتے ہیں (٧٢)

اور ان کے لئے ان میں کئی طرح کے فائدے ہیں اور پینے کی چیزیں ہیں، تو کیا وہ شکر نہیں کرتے؟ (٧٣)

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۶۹﴾

''اور نہیں سکھائی ہم نے انہیں شاعری اور نہ ہی یہ ان کی شان کے لائق ہے۔ یہ تو نہیں بس مگر بصیرت افروز حقیقتیں اور محکم قرآنی باتیں''۔

قرآن مجید نے یہاں رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے ایک ایمان افروز اور جنت پرور پہلو سے پردہ سرکایا اور کہا کہ آپ کو ہم نے شاعری کی تعلیم نہیں دی تھی اور نہ ہی یہ شاعری آپ کے شایانِ شان تھی۔

رسول اکرم ﷺ کی شان کیا ہے اور شاعری میں عموماً وہ کون سی کمزوریاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے حضور اکرم ﷺ کی طرف شعر وسخن کے انتساب کو قرآن مجید نے مناسب نہیں جانا۔ اوائل ہی میں یہ بات ذہن میں رکھ لی جائے کہ یہاں قرآن مجید کا موضع شعریت کی مذمت ہرگز نہیں بلکہ اس کا موضوع یہ ہے کہ شاعری رسول اکرم ﷺ کے شایانِ شان نہیں۔ جہاں تک الفاظ کی کھنا کھن، تخیل کی شوخیوں، کمال فن کی عظمتوں، لہجوں کے بانکپن اور نظم وسخن کی لہروں کا تعلق ہے۔ قرآن مجید ہرگز ذوق لطیف سے تعلق رکھنے والے ان دو اعیات کا منکر نہیں۔ قرآن مجید کا دعویٰ یہ ہے کہ شعرا اپنی تمام تر لطافتوں کے باوجود میرے رسول اکرم ﷺ کے شایان شان نہیں۔ شعروں کا سرچشمہ چونکہ تصورات وتخیلات ہوتے ہیں اس لئے یہ ایک نبی کی شان کے لائق نہیں ہو سکتے۔ انبیاء اور رسول تو ایک لفظ بھی تصور اور تخیل سے نہیں کہتے بلکہ ان کی ہر بات اور ہر قول کا سرچشمہ وحی ہوتی ہے۔ ابن عاشور نے شاید اسی لئے آیہ کریمہ کا مفہوم یہ لکھا ہے کہ ''ہم نے ان کو شاعری کی تعلیم نہیں دی بلکہ قرآن سکھلایا ہے۔ جو ان کی اونچی شان کے لائق ہے(154)۔'' شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ'' آیت میں شعر سے مراد مجمل کلام ہے، یعنی اللہ رب العزت نے اپنے نبی کو ہر بات نہایت روشن، صریح اور واضح صورت میں عطا کی، اس میں مبالغہ ہے نہ شاعروں کی طرح کذب آرائی۔ ہر بات سچی، ہر دعویٰ پختہ، ہر دعوت محکم اور ہر بول صداقت اور سچائی میں ڈوبا ہوا ہے، سید محی الدین اچوی فرماتے ہیں کہ'' شعراء کی دنیا چونکہ ٹھنڈی اور بے بس آرزوؤں کی کہر میں الجھی ہوتی ہے اس لئے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا کہ ہمارا پیارا نبی اور محبوب رسول ﷺ صرف تمناؤں کی قہر آلود فضاؤں میں زندگی بسر نہیں فرماتا بلکہ حقائق کی رم جھم برستی بارش میں رہتا ہے، جہاں وہموں کے میل کچیل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، رسولوں کے نزدیک الفاظ کے جامے اتنے قیمتی نہیں ہوتے جتنے معانی

مفردات

وَمَا: اور نہیں ''ما'' یہاں نافیہ ہے

عَلَّمْنٰهُ: سکھایا ہم نے اسے یہاں تعلیم کا معنیٰ تعلیم وحی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:''وعلمه شديد القوى'' جملہ معطوفہ ہے اور عطف ''يقولون هذا الوعد'' پر ہے

الشِّعْرَ: الكلام الموزون
ایسا موزوں کلام جس میں قافیہ کی رعایت رکھی گئی ہو۔ ترکیب میں ''الشعر'' مفعول ثانی واقع ہو رہا ہے۔ تقدیر عبارت اصل میں یوں تھی: نحن علمنه القران وما علمنه الشعر

وَمَا: اور نہیں
''و'' اعتراضیہ ہے اور ''ما'' نافیہ ہے اور موصولہ ہو تو بھی بقول ابن عاشور مفہوم بنے گا کہ ہم نے نبی کو شعر کی تعلیم نہیں دی بلکہ قران سکھایا جو ان کی شان کے لائق ہے

يَنْۢبَغِيْ: اس کا بنیادی معنیٰ کسی چیز کو طلب کرنا ہوتا ہے اور موقع اور محل کی مناسبت سے بگڑ جانا بھی اس کے مفہوم میں شامل رہتا ہے۔ ''ينبغي'' کے صیغے میں جب یہ مادہ استعمال ہو تو دو چیزوں میں ایک کی طرف رجحان رکھنے کا معنیٰ دیتا ہے اور محاورۃً اس کا مفہوم ہوتا ہے مناسب نہیں، جائز نہیں اور نہیں چاہئے وغیرہ

کی حقیقتیں معتبر ہوتی ہیں۔ان کا ذہن شاعروں کی طرح تغیر پذیر حالات سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہ حالات کو متاثر کرنے پر قادر رہتے ہیں(155)۔سوال یہ ہے کہ اگر وہ شاعر نہیں ہوتے تو پھر جو کچھ وہ لاتے ہیں اسے کیا کہا جا سکتا ہے۔ ذہن کی اس الجھن کو وحی کا نور فوراً ان الفاظ کے ساتھ رفع کر دیتا ہے کہ " ان ھو الا ذکر و قرآن مبین "گویا رسول کے ہاتھ میں پکڑا ہوا صحیفہ کوئی ایسا موزوں کلام نہیں جو نفس یا ذہن کی ساخت ہو وہ تو محکم، سادہ، سلیس، قابل فہم اور لائق عمل ٹھوس نصیحت ہے اوت حقائق عالم پر مشتمل ادراک و ذہن کو خدا آشنا کرنے والا قرآن ہے،جس کی ہر بات واضح ،صریح اور روشن ہے۔ باتیں الجھاؤ نہیں رکھتیں،دعوتیں پیچیدہ نہیں ہونے پاتیں،تنبیہات تکلف سے خالی رہتی ہیں،احکام گنجلک نہیں ہوتے ،دعوے نتائج سے زیادہ ٹھوس ہوتے ہیں اور نتائج دعوں سے زیادہ اٹل ہوتے ہیں۔

قرآن پڑھنے والو!

نزول وحی کی عرفان پرور برستی بارش کا فیضان ملاحظہ ہو کہ عربوں کے نزدیک کسی شخص کا شاعر ہونا چھوٹی بات نہ تھی لیکن یہاں وہ حضور ﷺ کو شاعر کہہ کر انسانوں کو نبوت اور رسالت سے جو اتصال باللہ کا واحد ذریعہ ہوتی ہے منحرف کرنے کے لئے کوشاں تھے اور حضور ﷺ کو شاعر کہہ رہے تھے۔قرآن مجید نے بصائر کا کیا رنگ بکھیرا اور کہا کہ قرآنی ضرورت فقط اتنی ہی نہیں کہ تم رسول اللہ ﷺ کو فصیح و بلیغ خطیب کہہ دو بلکہ تقاضا یہ ہے کہ انہیں رسول تسلیم کرو، نبی مانو اور ان کے واحد وسیلہ ہونے کا دل و جان سے اقرار کرو اور جو کچھ وہ لے کر آئے ہیں اس سے نصیحت پکڑو اس لئے کہ وہ قرآن مبین ہے۔

قارئین!

یہ آیت ہمیں سکھلاتی ہے کہ بڑے حقائق سے انحراف کی قیمت پر چھوٹی اور معمولی حقیقتوں پر قناعت دانش مندی نہیں ہوتی۔

الجھاؤ، پیچیدگیاں اور تکلف مناسب عادتیں نہیں ہوتیں۔

اچھے اور سچے انسان وہ ہوتے ہیں جو ٹھوس، اٹل، اور پائیدار اقدار کی بالادستی کے لئے تگ و تاز میں مشغول رہتے ہیں۔

نصیحتوں کا یہ نور تلاش کرنا چاہو تو دیکھو وہ دیکھو، تمہیں رسول باکمال اور نبی باجمال حضور ﷺ نظر آئیں گے جن کے ہاتھ میں مہر درخشاں سے زیادہ چمکتا ہوا صحیفہ پکڑا ہے جن کی ہر بات ہر روز سورج سے زیادہ روشنی دیتی ہے اور پھولوں سے زیادہ خوشبوئیں بانٹتی ہے۔

مفردات

وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ: جملہ معترضہ ہے دو متعاطف جملوں کے درمیان

لَهٗ: اس میں ضمیر کا مرجع وہی ہے جو "علمنا" میں ہے۔ابن عطیہ نے اس کا مرجع قرآن بنانا بھی جائز رکھا ہے

اِنْ هُوَ: نہیں ہے وہ استیناف بیانی ہے اور "ھو" کا مرجع قرآن مجید ہے

اِلَّا: استثنا بمعنٰی مگر

ذِكْرٌ: نصیحت مراد قرآن مجید

قُرْاٰنٌ: نام کتاب۔سب سے زیادہ پڑھا جانے والا صحیفہ

مُّبِيْنٌ: واضح اور روشن

لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝

''تا کہ وہ خبردار کریں اسے جو زندہ ہو اور قائم ہو جائے حجت انکار کرنے والوں پر''۔

اس آیۂ کریمہ میں ''سورہ یٰس'' کے تفسیری عمود ''انذار'' کو کمال بلاغت کے ساتھ قاری کتاب کے سامنے رکھا گیا ہے، لیکن صرف اتنا ہی نہیں کہ محض یہ سمجھ لیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ اور قرآن حکیم کا وظیفہ غرض وغایت فقط چند ماورائی حقائق سے انسانوں کو آگاہ کر دینا ہے، جن کے تسلیم کرنے اور نہ کرنے کا انسانی زندگی پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا اور یہ بھی نہ سمجھا جائے کہ قرآن مجید بدوی زندگی کی کوئی تہذیبی تخلیق ہے جسے کسی شاعر نے کسی خمار ریز چشمے کے کنارے بیٹھ کر گھڑ لیا ہے جس کا حلقہ تخاطب چند ایسے انسان ہیں جن کا فکری سفر جامد ماحول سے باہر نہیں نکلا اس قسم کی باتیں مردہ ادب، بے حس شاعری، یاس زدہ تخلیقات اور مایوسیوں میں ڈوبی ہوئی نثر کاریوں کے بارے میں سوچی جا سکتی ہیں لیکن کتاب زندہ، صحیفہ تابندہ اور قرآن حیات کے بارے میں ایسا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ قرآن مجید اس مقام پر گویا انسانی ذہنوں کو چیلنج کرتا ہے کہ وہ خوب فکر کر لیں اور سوچ لیں کہ صاحب قرآن اپنے صحیفہ دعوت کے ساتھ کسی قبرستان اور مردستان میں نہیں کھڑے ہیں بلکہ وہ زندہ انسانوں کے سامنے اعظم و اکبر کتاب لے کر نہایت دوٹوک اور واشگاف انداز میں ہر صاحب صلاحیت انسان کو جھنجھوڑ رہے ہیں ان کی صدائے دعوت کے ارتعاش سے اٹھنے والی لہریں گویا زندگی کے فیضان بانٹ رہی ہیں۔ سورج جس طرح روشنی بانٹتا ہے اور اس کی نورانی شعائیں زمین کو پاکیزگی کا غسل دے دیتی ہیں ایسے ہی رسول معظم ﷺ کے انذار کا فیضان یہ ہے کہ وہ عقل وشعور اور قلب ونگاہ کو زندگی کا وہ لبادہ عطا فرما دیتے ہیں کہ مادی وجود کی یکسر کوئی قیمت نہیں رہتی انسان اپنے روحانی لباس میں جنتی پیکروں میں ڈھل جاتا ہے جسے نہ گرم دوزخ جلا سکتی ہے نہ ٹھنڈی لہریں اسے یخ بستہ کر سکتی ہیں۔

''من کان حیا'' سے قرآن مجید اپنے دعوتی دائروں کی وسعت کی طرف اشارہ کر رہا ہے رسول معظم ﷺ جو پیغام لے کر تشریف فرما ہوئے اس کے مخاطب مخصوص انسانی طبقات نہیں بلکہ جہاں جہاں اور جدھر جدھر جس وجود میں زندگی رینگ رہی ہے، مصطفٰے کریم ﷺ کی ہمدردیوں سے، شفقتوں اور رحمتوں کا فیضان ان کے لئے موجود ہے۔

انذار اور ''یحق القول'' کا زور خصوصا ان حلقوں کے لئے زیادہ ہے جو نبوی دعوات اور قرآنی تنبیہات کے منکر ہیں۔ قدیم مفسرین میں سے مختلف بزرگوں نے اس آیہ کریمہ کو مختلف طریق سے سمجھا ہے حضرت قتادہ فرمایا کرتے تھے ''حی'' سے مراد دل اور نظر کی زندگی ہے۔ زجاج فرماتے ہیں کہ ''حی'' استعارہ ہے جو عقل کے لئے استعمال ہوا ہے(157)۔ ابن جوزی کا خیال ہے کہ ''حی'' سے اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو اللہ

مفردات

لِّيُنْذِرَ: تا کہ وہ خبردار کریں

''لینذر'' کا تعلق ''علمنا'' سے ہے۔ ابن عطیہ نے محرر الوجیز میں مبین سے بھی اس کا تعلق بیان کیا ہے۔ ابن کثیر، عاصم، ابو عمر اور حمزہ کسائی اسے ''لینذر'' پڑھتے تھے جبکہ نافع، ابن عامر اور یعقوب اسے ''تا'' کے ساتھ ''لتنذر'' پڑھتے تھے اور ابو متوکل اور ابو جوزہ وغیرہم یا کو مرفوع اور ذال کو مفتوح پڑھتے تھے جلالین اور سلیمان جمل نے ہر دو قرائتیں نقل کی ہیں۔ (محرر الوجیز، روح المعانی، زاد المسیر، جمل، ابن جریر)

مَنْ: موصولہ، جو، اسے، جسے وغیرہ

كَانَ حَيًّا: زندہ یہ استعارہ ہے اور از قبیل مقرحہ کے ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اسے مجاز مرسل بنایا جائے (ابن جریر، روح المعانی)

يَحِقَّ: ثابت کرنا، قائم کرنا وغیرہ

الْقَوْلُ: بات

يَحِقَّ الْقَوْلُ: عذاب لازم آنا اور حجت قائم ہونا دونوں مراد ہو سکتے ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ اس میں استعارہ مکنیہ ہو۔ (روح المعانی، بیضاوی)

یحق القول کا عطف ''لینذر'' پر ہے۔ (ابن عاشور) اس لیے کہ اس طرح مجاز کا عطف حقیقت پر ہوگا۔

عَلَى الْكٰفِرِيْنَ: منکرین پر ''المستمرون علی کفرھم''

مفردات

جل مجدہ کے علم میں مؤمن ہیں(158)اور بعض ائمہ تفسیر نے "حی" کا اطلاق تمام مؤمنوں پر بھی کیا ہے(159)۔
بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ صدائے حق جب بھی بلند ہو کچھ لوگ بیدار مغز ہوتے ہیں وہ فوراً لبیک کہتے ہیں اور حق سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔قرآن مجید ایسے ہی افراد کو زندہ افراد قرار دیتا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ زندگی اگر عمدہ مقاصد کے لئے جدوجہد اور تگ وتاز کا نام ہے تو پھر کیڑوں کی طرح رینگنا، پرندوں کی طرح اڑنا، مویشیوں کی طرح کھانا، کچھ معنی نہیں رکھتا۔زندگی تو اس بہار کا نام ہوتا ہے جس میں افکار کے غنچے چٹک کر پھول بنتے ہیں اور دلوں میں ایمان کی خوشبوئیں گویا فردوس سمو دیتی ہیں۔

"یحق القول" کا مفہوم مفسرین نے دو طرح بیان کیا ہے:

ایک تو منکرین ہر حجت کا قائم کرنا ہے(160)۔

اور دوسرا عذاب الٰہی کی وعید کا پورا ہونا ہے(161)۔

فردوس کتاب سے بہرہ مند ہونے والے قارئین!

زمین دل کو شور نہ بناؤ، اس لئے کہ شور زمین سے ہزاروں بار بارش کے باوجود سنبل نہیں اگا کرتے۔
ضرورت ہے کہ تم نرم ہو جاؤ اور گوش برآواز ہو کر اس سرمدی نغمہ کو سنو جس میں تمہاری روحانی نشاط مضمر ہے۔
قرآن مجید میں غور وفکر کیا کرو اس لئے کہ اس میں دلوں کو حیات بخشنے والی بہار موجود ہے،
گناہوں سے مجتنب رہو اس لئے کہ اس سے دلوں کی زندگی کم ہوتی ہے۔

آؤ مل کر دعا کریں:

آسمانوں اور زمینوں کے نور!
ہمارے دلوں کو بھی اپنی عطا کی روشنیوں سے جگمگا دے
آدم علیہ السلام کی توبہ قبول کرنے والے غفور رب!
ہمارے کبائر اور صغائر ہمارے دلوں سے زندگی نوچ رہے ہیں
مولا ہمیں معاف فرما دیا ور دائمی ابدی زندگی کی راحتیں عطا فرما
ایسی زندگی جس میں ہماری آنکھیں تجھے دیکھتی رہیں
ہمارے کان صرف تیری باتیں سنتے رہیں
ہمارا شعور تیرا متوالا رہے
اور ہمارے بدن تیرے حبیب ﷺ کی غلامی میں مستاں رہیں۔

آمین بحرمة سید المرسلین و شفیع المذنبین صلی اللہ علیه و اله وسلم
و ازواجه و عترته و اصحابه و امته اجمعین والحمد للہ رب العالمین

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾
وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ
وَمَشَارِبُ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

''کیا وہ یہ نہ دیکھ پائے کہ ہم نے پیدا کیا ان کے لئے اپنے ہاتھوں کے عمل سے مویشیوں کو اور اب یہ ان کے مالک ہیں اور ہم نے انہیں ان کے تابع کر دیا تو ان میں سے کچھ پر وہ سواری کرتے ہیں اور بعض کو ان میں سے وہ کھاتے ہیں اور ان کے لئے ان میں کئی طرح کے فائدے ہیں اور پینے کی چیزیں ہیں تو کیا وہ شکر نہیں کرتے''۔

گذشتہ آیات میں ایک ایسی زندگی کا ذکر کیا گیا ہے جو مخبر صادق ﷺ کے ''انذار بالقرآن'' سے جنم لیتی ہے اب بتایا جا رہا ہے کہ وہ حیات جس کا سرچشمہ قرآنی دعوتیں ہوں اس کا امتیاز ایک ایسا لافانی، زبردست اور راحت آفرین عرفان ہوتا ہے جس سے زندگی بابندگی نظر آنے لگ جاتی ہے اور ایک انسان کا رکا ہے حیات کی ہر چیز میں توحید کے جلوے دیکھنے لگ جاتا ہے، شرک سے اسے طبعی نفرت ہو جاتی ہے، شکر گزاری کے جذبے دل کی کھیتی میں پروان چڑھنے لگ جاتے ہیں۔ ذہن نہایت تیزی اور سرعت سے غور و فکر کا وظیفہ پورا کرنے پر آمادہ رہنے لگ جاتا ہے۔ انسانوں کی روحانی، ذہنی، قلبی، سماجی اور عملی تربیت کا ارتقائی انداز ملاحظہ ہو کہ سب سے پہلے کہا جاتا ہے:

اَوَلَمْ يَرَوْا

کیا وہ دیکھ نہ پائے
کیا وہ کوشش نہ کر سکے کہ دیکھیں
کیا انہوں نے دیکھا نہیں

گویا معرفت کے سچے متلاشی لوگوں کے لئے کتاب معرفت کا کوئی ورق پوشیدہ نہیں، وہ جدھر چاہیں، جیسا چاہیں، جسے چاہیں، جتنی دیر کے لئے چاہیں، دیکھ لیں اور الوہیت اور توحید کی کوئی دلیل پردہ اخفا میں نہیں، کائنات کی ہر چیز بول بول کر معرفت کے راز کھول رہی ہے۔ اگر کسی ناہنجار کو آیات الٰہیہ کے پھیلے سلسلے متاثر نہ کر رہے ہوں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کی آنکھوں نے ابھی کچھ دیکھا ہی نہیں، اس کے دل نے پردہ حسن کو سرکا کر جھانکنے کی کوشش ہی نہیں کی، اس کے ذہن نے دنیائے حسن کے نظر افروز نظاروں میں غور و فکر کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔

''اولم یرو'' کے بعد ''انا خلقنا'' کے الفاظ قابل غور ہیں'' بے شک ہم نے پیدا کیا'' انسان کا احساس اگر اس کا رہنما ہو کر اسے صرف اتنا ہی منوا لے کہ تخلیق ارض سے لے کر تخلیق فلک و سما تک اور تخلیق

مفردات

اَوَ: کیا
لَمْ: نہیں
يَرَوْا: دیکھا انہوں نے'' اولم یروا'' ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے اور تعجب کا معنٰی بھی دیتا ہے۔ واؤ عطف کے لیے ہے جس کا معطوف مقدر ہے۔ اصل عبارت یوں تھی: ا ینکسر بعث ولم یروا (مظہری و روح البیان)
اَنَّا: ہم نے
خَلَقْنَا: پیدا کیا ہم نے
لَهُمْ: ان کے لیے
یہاں لام حکمت کے لیے ہے
مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ: اس سے جو بنایا ہمارے ہاتھوں نے۔ ''مما عملت'' سے اشارہ حصر کی طرف ہے یعنی جو کچھ بنایا ہمارے ہاتھوں نے بنایا
اَنْعَامًا: چوپائے مویشی
یہ ''خلقنا'' کا مفعول ہے
فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ: تو وہ مالک ہیں ان کے اس میں دو قول ہیں: قتادہ، مقاتل، زجاج کہتے ہیں کہ ملک سے مراد قبضہ ہے اور ابن جریر مسخر ہونے کا معنٰی بیان کرتے ہیں

نفس سے لے کر روح وثریٰ تک کوئی بھی چیز اس کے ہاتھ کا عمل نہیں، یہ محض سچے خدا کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں تو عجز کا یہ انداز بذات خود بندگی بن جائے گا اور پھر یہ محسوسات ہی آہستہ آہستہ سر نیاز کسی ایک خدا کے سامنے جھکانے پر مجبور کر دیں گے اور "لاخالق الاالله" ماننے والا "لااله الا الله" بھی تسلیم کر لے گا۔

عجیب بات یہ ہے کہ رب تعالیٰ یوں تو کائنات کی ہر چیز کا خالق ہے لیکن یہاں سب کچھ چھوڑ کر صرف چوپاؤں کے خالق ہونے کا ذکر کر رہا ہے:

"بے شک ہم نے اس کے لئے اپنے ہاتھوں کے عمل سے مویشی بنائے"۔

شاید یہ اس لئے کہ کہ غبی سے غبی انسان بھی خدا کی یہ شان قریب تر سے دیکھ لے اور پھر اپنے مشاہدات سے معرفت حق کے اعلیٰ مدارج تک رسائی حاصل کر لے گویا قرآن مجید انسانوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اگر تم کائنات کی دقیق چیزوں میں غور وفکر نہیں کر سکتے تو تمھارے سامنے چلنے پھرنے والے چوپائے تو ہمہ دم تمہاری نگاہوں کے سامنے رہتے ہیں، انہی میں غور وفکر کر لو کہ انہیں رب تعالیٰ نے کیسے کیسے پیدا کیا، تخلیق میں تنوع ہے اور تنوع میں اتحاد بھی اور پھر ان سب کو حسن کے نئے نئے جامع بھی عطا کر رکھے ہیں اور پھر تخلیق ہی نہیں تسخیر کے نظام میں بھی غور کرو، پیدا سب کچھ اس نے کیا لیکن لطف وکرم کا یہ انداز کہ مالک تمہیں بنا دیا اب جس پر تم چاہو سواری کر لو، جسے تم چاہو بچھا کر ذبح کر لو اور اس کا گوشت کھاتے پھرو، ان میں منافع ایسے کے اون کے لباسوں سے لے کر خیموں تک اور ٹوپیوں سے لے کر جوتوں تک نہ جانے تم کیا کیا بناتے ہو اور ان میں تو کئی ایک ایسے بھی ہیں کہ ان کے دودھ سے تمہاری غذائی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔

"رکوب" اور "یاکلون" ہر دو سے پہلے "منھا" میں من تبعیضیہ کا استعمال بھی دلچسپی سے خالی نہیں، یہ سب جانور بھی سواری کے کام نہیں آتے اور سب کا گوشت بھی نہیں کھایا جا سکتا اور سب مسخر بھی نہیں اونٹ گرا کر ذبح کیا جا سکتا ہے لیکن بلی کو پکڑنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ اشیاء کائنات کی یہ نوعا نوعی بذات خود الوہیت باری کی زبردست دلیل ہے۔

اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ

استفہام انکاری ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اللہ کی بے پایاں نعمتوں کو دیکھ کر اپنے سینوں میں احساس تشکر ابھارے اور زندگی ذمہ دارانہ احساس کے ساتھ بسر کرنا سیکھے اور وہ کلام جو دقیق نکتے سمجھا رہا ہے، شاعری سمجھنے کی بجائے اللہ کا کلام معجز نما سمجھے اور اس کی دعوات پر لبیک کہیں اور اسے پیش کرنے والے رسول کو اپنی زندگی میں اپنے ہر فیصلے اور عمل کا امام جانے۔

مفردات

وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ: اور تابع کیا ہم نے ان کے "ذلۃ اور ذلالۃ" کا معنی ہیں کسی کی سختی اور منہ زوری کا ٹوٹ جانا اور مطیع اور فرمانبردار ہو جانا (لغات القرآن)

فَمِنْهَا: بعض ان میں سے یہاں "من" تبعیضیہ ہے

رَكُوْبُهُمْ: سواریاں ان کی

ابی نے رکوب کو "رکوبہ" پڑھا ہے اور حسن نے رکوب پڑھا ہے

وَمِنْهَا: اور ان میں سے

يَاْكُلُوْنَ: وہ کھاتے ہیں

وَلَهُمْ فِيْهَا: اور ان کے لیے اس میں

مَنَافِعُ: نفع کے پہلو یا نفع مند

وَمَشَارِبُ: اور پینا مشرب

فتحہ کے ساتھ مصدر ہے یا اسم مکان ہے (حسنات)

اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ: تو کیا وہ شکر نہیں کرتے

یہاں "افلا" میں استفہام تعجبی ہے (التحریر)

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾
لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿۷۵﴾
فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۶﴾
اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۷﴾
وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴿۷۸﴾

اورانہوں نے بنالئے سوااللہ کے دوسرے معبوداس اُمید پر کہ ان کی مدد کی جائے (۷۴)

گھڑے ہوئے معبود طاقت نہیں رکھتے کہ ان کی مدد کریں اور انہیں دیکھیں کہ ان کے لئے حاضر باش لشکر بنے ہوئے ہیں (۷۵)

توان کی کوئی بات آپ کوغم میں نہ ڈالے، بے شک ہم جانتے ہیں جو کچھ وہ چھپا کر کرتے ہیں اور جو کچھ اعلانیہ کرتے ہیں (۷۶)

کیاانسان دیکھتانہیں ہے کہ ہم نے اس کی تخلیق ایک بوند بھر پانی سے کی تو اچانک وہ کھلا حریف حق ہو کراٹھ کھڑا ہوا (۷۷)

اب وہ ہمارے لئے مثالیں بیان کرنے لگا اور بھول گیا اپنی تخلیق کو اور کہتا ہے کون زندہ کرے گا ان ہڈیوں کو جب یہ گل سڑ کر بوسیدہ ہو جائیں گی (۷۸)

مفردات

وَاتَّخَذُوْا: اور بنا لیے انہوں نے
مِنْ: سے
دُوْنِ اللّٰهِ: اللہ کے سوا
اٰلِهَةً: معبود
لَعَلَّهُمْ: تا کہ وہ
يُنْصَرُوْنَ: مدد کیے جائیں
لَا: نہیں
يَسْتَطِيْعُوْنَ: طاقت رکھتے ہیں
نَصْرَهُمْ: ان کی مدد
وَهُمْ: اور وہ
لَهُمْ: ان کے لیے
جُنْدٌ: لشکر
مُّحْضَرُوْنَ: حاضر باش

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿۷۵﴾

''اور انھوں نے بنا لئے سوا اللہ کے دوسرے معبود اس امید پر کہ ان کی مدد کی جائے (گھڑے ہوئے معبود) طاقت نہیں رکھتے کہ ان کی مدد کریں اور انھیں دیکھیں کہ ان کے لئے حاضر باش لشکر بنے ہوئے ہیں''۔

وہ لوگ جن کی نظریں جہان حسن کے ہر نظارے سے پھسل کر گزر جاتی ہیں ان کی ناشکری کا یہ شخصیت سوز نظریہ انہیں کبھی بھی ایک ذمہ دار شخص کی متانت اور سنجیدگی عطا نہیں کر سکتا۔ وہ منعم حقیقی کی ان گنت نعمتیں استعمال میں لاتے ہیں لیکن سپاس گزاری کا ایک لفظ بھی ان کی زبان پر نہیں آتا۔ ان کی زبانیں شکر کی بجا آوری سے ہمیشہ گونگی رہتی ہیں۔ وہ جانوروں کی چھاتی سے امڈتے دودھ کی حلاوتوں سے نشاط مند ہوتے ہیں لیکن کبھی ان کے خالق کی عظمتوں کا ترانہ نہیں الاپتے۔ شکر تو دور کی بات ہے ان کے ظلم کی حد انتہا یہ کہ کھاتے اس کا ہیں لیکن گیت اوروں کے گاتے ہیں۔ اس جہان میں بہتی ندیوں سے لے کر محو پرواز پرندوں تک خدائے بے نیاز نے گوناگوں چیزیں انہیں مسخر کر کے دیں لیکن ان کا حال یہ ہے کہ سر عجز اس کے سامنے جھکانے کی بجائے اسے ہی کمزور تصور کرتے ہیں اور دماغ کی باطل مشق سے نابودی چیزوں کو بھی خدا کہنے پر تلے بیٹھے ہیں۔

''واتخذوا'' کے قرآنی الفاظ حد درجہ دلچسپ ہیں، اس لئے کہ ایک ہوتا ہے خدا ہونا اور ایک ہوتا ہے خدا بنا لینا۔ جہاں تک خدا ہونے کا تعلق ہے تو وہ سچا خدا ایک ہی ہے کوئی مانے نہ مانے، کوئی تسلیم کرے نہ کرے، الٰہ تو بس وہی ہے لیکن فسوں ساز ذہن کے کرشمہ سازیاں دیکھئے کہ جب اختیار واقتدار کا نشہ اس کے مغز میں کیڑا بن کر کاٹتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ خدا بھی ایسا ہو جو اس کے قابو میں رہے پھر اسی ایمان سوز مستی میں مدہوش رہنے کے لئے وہ اپنے ہاتھوں خود خدا گھڑتا ہے۔ بات یہ نہیں کہ وہ اس کے خدا ہوتے ہیں بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس کے قابو میں ہوتے ہیں، چاہو تو سامنے جھک لو اور چاہو تو اٹھا کر دریا برد کر دو، الٰہ گری اور بت سازی کے اس کارخانے میں محنت اٹھانے والے مشرکین سمجھتے ہیں کہ وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور جن کے سامنے وہ ناصیہ فرسائی اور جبیں آسائی کر رہے ہیں وہ بھی ان کی مدد کرنے والے ہیں نہیں ہرگز نہیں ایسا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ طوفان نوح جب امڈ پڑتا ہے تو پھر ریت کے ان گھروندوں کا بچنا محال ہوتا ہے۔ اعتقاد کی دنیا کا زبردست قرآنی اعلان سنئے:

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ

مشرکین الٰہ برحق کی چوکھٹ سے ہٹ کر کسی بت کو پوجیں یا کسی آسمانی سیارے کو، کسی فرد کی عبادت

کریں یا جماعت کی، کسی قانون کے سامنے سرفگندہ ہو یا کسی نظام کے۔ خدائے محمد ﷺ سے کٹ کر جس کو بھی پوجیں گے، مدد تو مدد، ذلت اور رسوائی ان کا مقدر بن جائے گی۔ وہ مشرکین جو اپنی حماقت سے بے جان مورتیوں کو خدا تصور کرتے ہیں اور انہیں نافع اور ضار سمجھتے ہیں، ان سے مدد کے طلب گار ہوتے ہیں، ان کے ذہنی افلاس اور فکری درماندگیوں کی انتہا ہے۔ کیا انہیں اتنی سی بات بھی نہیں سوجھتی کہ جو خود بے بس اور محتاج ہوں وہ کسی دوسرے کی دنیا کیا آباد کریں گے۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید نے ایک دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا:

وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ (الاعراف:192)

''ھم'' ضمیر کا مرجع منکرین حق اور بت پرست ہیں اور ''لھم'' کا مرجع ان کے باطل معبود ہے۔ مفہوم تفصیلی یہ ہے کہ ضمیر کے ان مردوں کو دیکھو کے کہ بتوں کے لئے یہ لشکر بنے بیٹھے ہیں۔ ائمہ تفسیر نے اس حصہ کا ایک دوسرا مفہوم بیان کیا ہے کہ ان کے وہ معبودان باطل جنہیں وہ آج اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں کل یہی ایسا لشکر ہوں گے جو ان کی مدد کرنے کی بجائے انہیں کہ خلاف عذاب کا مواد فراہم کریں گے۔

فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۶﴾

''تو ان کی کوئی بات آپ کو غم میں نہ ڈالے بے شک ہم جانتے ہیں جو کچھ وہ چھپا کر کرتے ہیں اور جو کچھ اعلانیہ کرتے ہیں''۔

وہ منظر ذرا چشم تصور کے سامنے لائیں، رسول حسن ﷺ بارگاہ الٰہیہ میں کھڑے ہیں۔ رب کریم اپنے پیارے حبیب کی وہ محنتیں دیکھ رہا ہے جو انہوں نے دین حق کی سربلندی کے لئے اٹھائیں۔ ناہنجار اور نکمے لوگوں نے رسول رحمت ﷺ کی شفقتوں اور رحمتوں کی ناشکری کرتے ہوئے پھبتیاں کسیں، طعنے دیئے، شاعر کہا، کاہن ہونے کی گالیاں دیں، آپ کے خلاف کذب آرائی کے طوفان اٹھائے، بے اصل باتیں منسوب کیں، مجنون ہونے کا پروپیگنڈا کیا، دعوت حق کو نیچا دکھانے کے لئے افترا کئے، الزامات کی کالک بکھیری، ہٹ دھرمیوں کا مظاہرہ کیا، پرچم حق وصداقت کو سرنگوں کرنے کی منصوبہ بندیاں کیں اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ محبوب ﷺ کے سامنے ان کے عشق کی توہین کی، ان کے پروردگار کا انکار کیا، انہیں زچ کرنے کے لئے بتوں کے معروف کو منکر جانا اور منکر کو معروف سمجھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر پروردگار نے اپنے پیارے حبیب ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ

اے حبیب ﷺ!

ان کی کوئی بات

ان کا کوئی عمل

مفردات

فَلَا: پس نہ

يَحْزُنْكَ: غم میں ڈالے آپ کو ''حزن'' ہر اس پریشانی کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انسان کو کسی بھی وجہ سے لاحق ہو جائے

قَوْلُهُمْ: ان کا قول

اِنَّا: بے شک ہم

نَعْلَمُ: جانتے ہیں

مَا: جو

يُسِرُّوْنَ: وہ چھپاتے ہیں

وَمَا: اور جو

يُعْلِنُوْنَ: وہ ظاہر کرتے ہیں

مفردات

ان کا کوئی منصوبہ
آپ کو پریشان نہ کرے
آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوں
آپ اپنی طبیعت عاطر پر بوجھ نہ لائیں
آپ غم نہ کھائیں خدا ہر حالت میں آپ کی حفاظت کرنے والا ہے، وہ آپ کے ساتھ ہے، وہ ان کے ہر کرتوت سے باخبر ہے، ان کی نجی محفلیں بھی اس کی نظر میں ہیں اور ان کے گھناؤنے منصوبے بھی اس کے علم میں ہیں، ان کے ارادوں سے لے کر ان کے اعمال خواہ وہ چھپے ہوں یا ظاہر ہوں اللہ سبحانہ کے علم میں ہیں۔

پیارے حبیب! ﷺ
آپ غم نہ کھائیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ مستقبل کس کا ہے؟
فاتح کون ہوگا؟ اور رسوائی کس کا مقدر بنے گی یقیناً وہ آنے والا دن خود فیصلہ کر دے گا جب قریہ قریہ، بستی بستی آپ کا نام گونجے گا اور ارض وسما پاک کلمے کے ورد سے منور ہو جائیں گے۔
قاری قرآن!
مومن کا عقیدہ اگر اخلاص دل سے بن جائے کہ اس کا خدا ڈھکی چھپی اور کھلی ظاہر ہر بات کا جاننے والا ہے تو لامحالہ وہ اپنے گرد حفاظت کے ایک مضبوط اور نورانی حصار کی دیواریں کھنچی پائے گا اور ایمان کا یہ تاباں ماحول اس کی نظر میں ہر کافر منکر اور بے دین کو بے وقعت اور ہلکا بنا دے گا اور یہی وہ نظریاتی انقلاب ہے جو انسانی معاشرہ کو تعمیر کی لازوال اساس فراہم کرتا ہے اور چاہیے بھی یہی کہ بندہ مومن ایسی ہی جستجوؤں سے نورا عتقاد کے اس حصار میں پناہ گزین رہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۷﴾

''کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اس کی تخلیق ایک بوند پانی سے کی تو اچانک وہ کھلا حریف حق ہو کر کھڑا ہو''۔

سید قطب فی ظلال القرآن میں لکھتے ہیں:

''ان آیات کا مضمون نہایت سادہ، لطیف اور منطق فطرت سے مطابقت رکھنے والا ہے اور پھر اس کی منطق ایسی واقعاتی ہے کہ اسے قریب ہی سے دیکھا جا سکتا ہے کیا نطفہ زندگی طاقت یا قیمت میں بوسیدہ ہڈیوں سے فوقیت رکھتا ہے جو ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں؟ کیا انسان اسی سے پیدا نہیں ہوا تھا؟ کیا وہ ذات جس نے اسے اس نطفہ سے اس قدر حسین انسان بنایا اور پھر اس میں منفعتوں کے لئے جھگڑے کا سلیقہ رکھا؟ وہ اس پر قادر

اَوَلَمْ: کیا نہیں
يَرَ: دیکھا
الْاِنْسَانُ: انسان نے
اَنَّا: بے شک ہم نے
خَلَقْنٰهُ: پیدا کیا اسے
مِنْ: سے
نُّطْفَةٍ: بوند بھر پانی
فَاِذَا هُوَ: تو دفعتہً وہ
خَصِيْمٌ: جھگڑالو
مُّبِيْنٌ: کھلا

مفردات

نہیں کہ ٹوٹی پھوٹی اور خستہ ہڈیوں کو زندگی کا نیا پیکر عطا فرمادے؟

ائمہ تفسیر نے ان آیات کی تفسیر میں ایک سبق آموز واقعہ نقل کیا ہے اگرچہ ناموں کے نقل کرنے میں تفسیری اختلاف پائے جاتے ہیں تاہم اس ضمن میں روایت شدہ تمام شواہد ایک حکایاتی پس منظر قاریٔ قرآن کے سامنے لاتے ہیں۔

عاص بن وائل یا ولید بن مغیرہ یا اُمیہ بن خلف ایک بوسیدہ ہڈی لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کیا آپ کا خدا اس خستہ اور بوسیدہ ہڈی میں دوبارہ جان پیدا کرے گا؟ پھر ہڈی کو اپنی مٹھی میں رکھ کر مسل دیا اور راکھ ہوا میں اڑا دی۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کی طرف سے خود جواب دیا:

''کیا انسان کو معلوم نہیں ہے کہ ہم نے اسے ایک قطرے سے پیدا کیا لیکن پیدا ہونے کے بعد وہ جھگڑالو بن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ہماری شان میں گستاخانہ گفتگو کرتا ہے اور ہم پر ہی مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے اور کہتا ہے کہ کون زندہ کرے گا مردہ ہڈیوں کو جبکہ وہ بوسیدہ ہو جائیں گی۔ آپ کہیں انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلی بار انہیں پیدا کیا اور وہی ہر طرح کی تخلیق کا علم رکھتا ہے''۔

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ

قرآن مجید کا یہ حصہ ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے جو صباح و مساء انسانیت کے عنوان سے گفتگو میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ قرآن مجید قدیم کتاب ہے لیکن اس کا عنوان انسانیت کسی بھی تازہ فکر کی طرح زندہ و توانا اور سرسبز و شاداب دکھائی دے رہا ہے اور پھر جو بات کہی گئی ہے وہ تشکیل افکار کے مروجہ فلسفوں سے بالکل ہٹ کر ایک دعوت کی صورت میں پیش کی گئی ہے۔ یعنی ضروری نہیں کہ آپ کسی خاص مذہب یا مسلک کے حامی بن کر اس بات میں غور و فکر کریں بلکہ ایک آزاد اور عقلمند انسان کی حیثیت سے دیکھیں کہ ان کا آغاز زندگی کس قدر پستیوں سے کیا گیا ہے ایک بے قدر اور ناچیز پانی سے انسان کی تخلیق شروع ہوئی۔

خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ

انسانی زندگی کے پہلے مرحلے کے بعد غور و فکر کے لئے اس کی زندگی کا آخری مرحلہ پیش کیا گیا اور اسے ''خصیم مبین'' قرار دیا گیا۔ عام مفسرین نے ''خصیم مبین'' کا معنی یہی نقل کیا کہ دیکھو نطفہ حقیر سے پیدا ہونے والا انسان کس طرح خدا ہی کے خلاف کھل کر کھڑا ہو گیا، لیکن یہاں انسان کی اس طبعی خصلت کی طرف بھی ایک باریک سی تعریض سمجھی جا سکتی ہے کہ انسان میں مسابقت کی حرارت اس قدر شدید ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر آدمی اور ہر شخص سے اعلیٰ و ارفع ہی تصور کرتا ہے۔ نفس کی جھوٹی تسلی کے لئے اسے سب کا مخالف بھی ہونا پڑے تو اس سے دریغ نہیں کرتا، گویا قرآن مجید یہاں انسان کی فکری

صلاحیتوں کو مقناطیس کی طرح کھینچ کر اس نقطے پر جمع کر دیتا ہے کہ اے انسان غور کر! بے قیمت وقدر پانی سے جس خدا نے تجھے پیدا کیا اور زندگی کے یہ رنگ عطا فرمائے کہ تو اپنے جیسا کسی کو سمجھتا ہی نہیں۔ کیا اس کے لئے مشکل ہے کہ وہ تجھے بوسیدہ ہڈیوں سے کھینچ کر زندگی کا نیا قالب عطا فرما دے۔

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝۷۸

''اب وہ ہمارے لئے مثالیں بیان کرنے لگا اور بھول گیا اپنی تخلیق کو اور کہتا ہے کون زندہ کرے گا ان ہڈیوں کو جب یہ گل سڑ کر بوسیدہ ہو جائیں گی''۔

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ

ایک بے خبر، خیرہ سر، غافل اور ناعاقبت اندیش انسان زندگی کے تخم کو کس طرح رائیگاں کر دیتا ہے۔ قرآن مجید یہاں فلک دانش پر قوس وقزح کی طرح بصیرتوں اور حکمتوں کے رنگ بکھیر دیتا ہے اور صاف طور پر اعلان کر دیتا ہے کہ نکما ترین شخص وہ ہوتا ہے جو اپنی اصل کو فراموش کر دیتا ہے اور اپنی اصل کو بھول جانے کا عمل زندگی میں وہ بے اعتدالیاں پیدا کر دیتا ہے کہ انسان اپنے مولیٰ ومالک کے لئے ہی مثالیں گھڑنے لگ جاتا ہے۔۔۔۔!!

یاد رہے کہ کامیاب دو ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک جو محبت سے اوپر دیکھنا سیکھ لیں اور ایک وہ جو عبرت کے لئے نیچے دیکھنا شروع کر دیں۔ وہ زیاں کار شخص جس کی نظر اوپر روشنیاں بھی نہ دیکھ سکے اور نیچے اپنی اصل تک رسائی بھی حاصل نہ کر پائے، وہ نفسیاتی اور ذہنی مریض ہوتا ہے اور عقل ودانش کے چراغ اس کے ہاں بجھ چکے ہوتے ہیں۔ وہ پھر پاگلوں کی طرح بولتا چلا جاتا ہے، بے اصل اور بیہودہ کلمات بکے جاتا ہے، اس کا پتھر دماغ سوچ ہی نہیں سکتا کہ زندگی کا خالق چاہے تو ہڈیوں کی راکھ سے حسن کے پیکر تخلیق دے دے جنھیں دیکھ کر فرشتے رشک کریں اور چاہے تو بے قدر پانی سے حسن صورت کے وہ کرشمے دکھائے کہ حوریں اور غلمان بھی انسانی صورتوں کی زیارت کے لئے ترساں رہیں۔

یہاں بھی ملحوظ خاطر رہے کہ پیغمبر ﷺ کی بات نہ ماننے پر قرآن مجید کا اسلوب اس قدر سخت اور پر دہشت ہو گیا کہ واضح طور پر ارشاد ہوا کہ پیارے حبیب ﷺ جو تیری نہیں مانتا گویا وہ بے اصل ہے اور بھول گیا ہے اپنی حقیقت کو۔ گندی جگہ سے پیدا ہونے والا گندہ مادہ آج یہ اور یہ بیان کرتا ہے۔ نہ خدا کی خدائی ہی اس کی سمجھ میں آ رہی ہے اور نہ مصطفیٰ ﷺ کی مصطفائی ہی سے وہ فیض یاب ہو رہا ہے۔

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ

حماقت کی حد انتہا کہ ایک شخص یہ کہے کہ جب ہڈیاں بوسیدہ ہو کر ریزہ ریزہ ہو جائیں تو ان میں کون ہے جو زندگی لوٹائے گا۔

مفردات

وَضَرَبَ لَنَا: اور بیان کرنے لگا ہمارے لیے
مَثَلًا: مثالیں
وَّنَسِيَ: اور بھول گیا وہ
خَلْقَهٗ: اپنی تخلیق کو
قَالَ: کہا اس نے
مَنْ: کون
يُّحْيِ: کون زندہ کرتا ہے
الْعِظَامَ: ہڈیاں
وَهِيَ: اور وہ
رَمِيْمٌ: بوسیدہ

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُۨ ﴿۷۹﴾
الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ﴿۸۰﴾
اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يَّخْلُقَ
مِثْلَهُمْ ۭ بَلٰي ۙ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۱﴾
اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾
فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

فرمایئے! زندہ کرے گا انہیں وہی جس نے پہلی بار انہیں بنایا تھا اور وہ ہر طرح کی پیدائش کو خوب جاننے والا ہے (۷۹)

جس نے بنادی تمہارے لئے سرسبز درخت سے آگ پس تم اس سے (آگ) روشن کر لیتے ہو (۸۰)

اور کیا وہ جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمینوں کو اس پر قادر نہیں کہ ان جیسوں کو پیدا کر دے، کیوں نہیں وہی عظیم الشان پیدا کرنے والا اور بہت جاننے والا ہے (۸۱)

اس کا کام دیکھئے کہ جب کسی چیز کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے حکم دیتا ہے ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے (۸۲)

پاک ہے وہ ذات جس کے دستِ قدرت میں ہر چیز کی حکومت ہے اور تم سب اسی کی طرف پھیر دیئے جاؤ گے (۸۳)

مفردات

قُلْ: کہہ دو
يُحْيِيْهَا: زندہ کرتا ہے انہیں
الَّذِيْٓ: وہ
اَنْشَاَهَآ: جس نے بنایا تھا انہیں
اَوَّلَ: پہلی
مَرَّةٍ: مرتبہ
وَهُوَ: اور وہ
بِكُلِّ: ہر چیز
خَلْقٍ: تخلیق
عَلِيْمُ: جاننے والا

قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ ۝

''فرمایئے! زندہ کرے گا انہیں وہی جس نے پہلی بار انہیں بنایا تھا اور وہ ہر طرح کی پیدائش کو خوب جاننے والا ہے''۔

قرآن مجید باطل استدلالات میں الجھے ہوئے مجہول انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ذرا مڑ کر پیچھے دیکھ، تو ایک بوند بھر پانی تھا پھر خالق مطلق نے ایک مردہ قطرے سے تجھے جماد میں بدلا، پھر تو متحرک گوشت کا لوتھڑا بنا اور زندگی تیرے جسم و جان میں سرایت کرنے لگی۔ اب تو خود ہی بتا کہ پانی سے زندگی نمودار کرنا دشوار ہے یا کسی بنے ہوئے انسان کی فنا کے بعد اسے دوبارہ لباس حیات عطا کرنا مشکل ہے۔

خیرہ سر اور غافل انسان!

کسی چیز کو پہلی بار بنانا مشکل ہوا کرتا ہے جس خدا نے نقش بر آب انسانی صورتیں جلوہ گر فرمائیں اس کے لئے کوئی دشوار نہیں کہ وہ بوسیدہ ہڈیوں کو زندگی کا نیا جامہ عطا فرما دے۔

وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ

آیت کے اس حصے میں اکثر مفسرین نے ''خلق'' کو مخلوق کے معنوں میں سمجھا ہے(162) یعنی اللہ تعالیٰ جمیع مخلوقات کو خوب جاننے والا ہے، ایسے نہیں جب کوئی مخلوق مر کر گل سڑ جائے گی تو اس کا خالق اسے بھول جائے گا۔ وہ ان کے وجود ایک ایک ذرے سے آگاہ ہے ایک مفسر نے کتنی خوبصورت بات لکھی:

> ''اگر ہم مٹی کے ڈھیر میں دیکھیں لوہے کے چھوٹے چھوٹے ذرات بکھرے ہوئے ہیں مقناطیس کا ایک ٹکڑا گھمائیں تو وہ فوراً ان تمام ذرات کو جمع کر لے گا حالانکہ وہ ایک بے جان وجود سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ خداوند تعالیٰ ہر انسان کے تمام ذراتِ بدن کو خواہ وہ کرہ زمین کے کسی بھی گوشہ میں ہوں ایک ہی حکم سے آسانی کے ساتھ جمع کر لے گا''(163)۔

''خلق'' سے یہاں ایک دوسرا مفہوم بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ انسانوں کے ذہن میں فقط اتنا ہی ہے کہ انسان بوند بھر پانی سے پیدا ہوتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے ان گنت طریقوں کو جاننے والا ہے۔ وہ چاہے تو نطفہ سے زندگی پیدا کر دے اور چاہے تو ہڈیوں میں روح حیات کارفرما کر دے۔ اس سے اشارہ اس جانب بھی ملتا ہے کہ حیات کو وجود میں لانے کا اللہ عزسبحانہ کے ہاں ایک ہی طریقہ نہیں۔ ممکنات کی وسیع کائنات بذات خود خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل ہے یہاں ''نسی خلقه'' اور ''وهو بكل خلق عظيم'' کو ایک ساتھ رکھ کر پڑھنے سے نہایت دلچسپ معنویت دماغ میں حسن پیدا کرتی ہے کہ دیکھو! یہ جھگڑالو انسان اپنے آپ کو خدا کا زبردست حریف اور خصیم تصور کرتا ہے اور مثالیں

گھڑ گھڑ کے خدا سے مقابلہ کرتا ہے حالانکہ اسے دیکھئے کہ یہ خود اپنی اصل کو بھول گیا ہے اور وہ خدا جس کا یہ اپنے آپ کو حریف سمجھتا ہے وہ کائنات کی ایک ایک چیز کی تخلیق سے باخبر ہے۔ ایسے بے خبر، ناداں اور مجہول انسان کا کیا مقابلہ، اس عظیم اور قادر ذات سے جس کے ایک اشارے ہی سے ان گنت تازہ جہاں تخلیق پا لیتے ہیں۔

مغرور اور فراموش کار انسان!

قرآن کی اس دعوت کو مت بھولو کہ تمہیں ایک دن مرنا ہے اور پھر مر کر دوبارہ زندہ ہونا ہے۔ تم پر لازم ہے کہ اپنی اصلیت کو آئینہ بنا کر اپنے سامنے رکھو۔ ایسا آئینہ جس میں ہمہ دم تمہیں اپنی تصویر دکھائی دیتی رہے۔ اپنی اصل کو نہ بھولو تو تمہاری کوئی بات تمہارے سچے خدا کے علم سے باہر نہیں۔

الَّذِىۡ جَعَلَ لَكُمۡ مِّنَ الشَّجَرِ الۡاَخۡضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنۡتُمۡ مِّنۡهُ تُوۡقِدُوۡنَ ۝٨٠

"جس نے بنادی تمہارے لئے سرسبز درخت سے آگ پس تم اس سے (آگ) روشن کر لیتے ہو"۔

قرآن کریم کی اس آیہ کریمہ کو سمجھنے کے لئے سورہ واقعہ کی اس آیت کا بھی مطالعہ کرلیا جائے (164)۔

اَفَرَءَيۡتُمُ النَّارَ الَّتِىۡ تُوۡرُوۡنَ ۝٧١ ءَاَنۡتُمۡ اَنۡشَاۡتُمۡ شَجَرَتَهَاۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡشِـُٔوۡنَ ۝٧٢

"کیا تم نے کبھی سوچا اس آگ کے بارے میں جسے تم روشن کرتے ہو، کیا تم نے اس درخت کو بنایا جس سے وہ آگ نکلتی ہے یا ہم اُسے پیدا کرنے والے ہیں"۔

اس آیہ کریمہ میں تین چیزیں قابل غور ہیں:

ایک یہ کہ خدائے قادر کی توحید کا وہ کون سا استدلالی پہلو ہے جو سرسبز درخت سے آگ پیدا کرنے میں سمجھا جا سکتا ہے۔

دوسرا یہ کہ سرسبز درخت سے آگ پیدا کرنے کا تفسیری مفہوم کیا ہے؟

تیسرا یہ کہ اس حسین مثال میں قرآنی دعوات کی کون سی جھلک محسوس کی جا سکتی ہے۔ ہم نقطہ وار ان مفاہیم کو حاصل کرنے کی طرف بڑھتے ہیں۔

پہلا یہ کہ وہ ذات جو تضادات سے تفاوق کے امکان پیدا کرنے پر قادر ہو اس کے لئے کوئی مشکل نہیں کہ وہ مردہ انسان کی کھوئی ہوئی توانائیاں واپس کر دے اور انہیں پھر سے محسوس طور پر زندہ پیکر عطا فرمادے۔ بادی النظر میں آگ اور پانی کی کوئی مناسبت نہیں لیکن یہ اس ذات کبریا کی شان کاریگری ہے کہ رطوبات میں بھی حرارت اور آگ کا سماں پیدا کر رہا ہے۔ ایسی قادر ذات کے لئے کسی بھی چیز کا معاد ناممکن نہیں یہ سب وہ مشاہدات ہیں جنہیں نہایت سادگی سے آج کا

مفردات

الَّذِىۡ: وہ جس نے
جَعَلَ: بنایا
لَكُمۡ: تمہارے لیے
مِّنَ: سے
الشَّجَرِ: درخت
الۡاَخۡضَرِ: سبز
نَارًا: آگ
فَاِذَآ: تو دفعۃً
اَنۡتُمۡ: تم سب
مِّنۡهُ: اس سے
تُوۡقِدُوۡنَ: "وقد" آگ کو کہتے ہیں اور آگ کے روشن ہونے کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ وقود ایندھن کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ "اوقد اور استوقد" آگ روشن کرنا اکثر استعمال ہونے والے مادے ہیں

انسان سینکڑوں مرتبہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔

دوسرا یہ کہ سرسبز درخت سے آگ پیدا کرنے سے اشارہ ہے۔عربوں کے اس دستور کی طرف کہ جب انہیں آگ کی ضرورت ہوتی تو وہ ''مرخ'' درخت کی شاخ کو ''عفار'' کی شاخ سے رگڑتے تو چقماق کی طرح آگ پیدا ہوتی (165)۔ اور یہ بھی بعید نہیں کہ اس سے اشارہ درختوں کی اس رگڑ کی طرف ہو جس سے جنگلوں میں آگ لگ جاتی ہے (166)۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ درختوں کے خشک ہو جانے کے بعد ان کا بطور ایندھن استعمال ہونا آیت میں مذکور ہو (167)۔اور عصر جدید میں قرآن مجید کی اس حسین تعریض سے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ نباتات کا ایک اہم کام ہوا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ حاصل کرنا اور نباتاتی خلئے بنانا ہوتا ہے۔ درخت آکسیجن چھوڑتے ہیں اور کاربن کو وجود میں محفوظ رکھتے ہیں اور اسے پانی سے ترکیب دے کر جسم سازی کا عمل جاری کرتے ہیں اور اس سارے عمل میں سورج کی کچھ توانائی ان کے اندر جمع ہو جاتی ہے اور انہیں جلاتے وقت یہی سورج کی توانائی خارج ہوتی ہے اور پھر سورج کی طرف لوٹ جاتی ہے (168)۔ شاید اس سائنسی عمل کی طرف قرآن مجید کا یہ حصہ اشارہ کر رہا ہو۔ اس سے مفہوم تفسیری یہ ہوگا کہ وہ ذات جو سورج کی توانائی کو سرسبز درختوں میں تحلیل کرنے کے بعد پھر سے خارج کر کے واپس سورج کو لوٹا سکتی ہے اس کے لئے زندگی بعد الموت لوٹا دینا کوئی مشکل نہیں۔

تیسرا یہ کہ قاریٔ قرآن کو خدائے قادر و مالک کی کرشمہ سازیاں دیکھنے کے لئے کسی پیچیدہ نظام میں غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ وہ زندگی کے بعض سادہ اور سرسری سے واقعات سے بھی اکتساب فیض کر سکتا ہے۔ اسے دور جانے کی ضرورت نہیں، وہ اپنی آنکھوں کے سامنے جلتی ہوئی آگ ہی کو دیکھ لے، یہ وہ چیز ہے کہ درخت سرسبز ہو تو بھی اس کے اندر موجود رہتی ہے اور اگر وہ خشک ہو جائے تو بھی یہ بحال رہتی ہے۔ نہ صرف بحال بلکہ بڑھ بھی جاتی ہے صرف اس کی موجودگی کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ بس زندگی کو بھی یہی تصور کرلو، وہ نطفہ ہو تو بھی اس میں رقصاں ہوتی ہے اور جب وہ پیکر خاکی میں ڈھل جائے تو بھی اس میں کارفرما رہتی ہے اور جب یہ مر کر مٹی ہو جائے تو ہرگز یہ معنی نہ سمجھا جائے کہ زندگی کی آگ وہاں کلیتہً ٹھنڈی پڑ چکی ہے۔ یہ ہیں وہ تدبیر الٰہیہ کے آثار جنہیں آپ آگ اور رطوبات کے اس مختصر سے کھیل میں بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

مولائے کریم!
مولائے جلیل!
مولائے کبیر!
تو قادر ہے کہ سرسبز درختوں سے
آگ شعلہ زن ہو

تو قادر ہے کہ بوسیدہ ہڈیوں میں زندگی محو رقص ہو
تو قادر ہے کہ راکھ کے ڈھیر میں برق زیست کے کوندے لپٹیں
مولا!
آقا!
ہم مردوں میں بھی زندگی کی حرارت پیدا فرما
ہم نااہلوں میں بھی اہلیت کی روشنیاں برسا
شاخ سے شاخ ٹکرائے
تو چنگاریاں سلگیں
مولا! ہمارے دلوں اور اپنی شفیق نظروں کو یوں ملا
کہ محبتوں کی رم جھم بارش برسے
اور پھر بارانِ محبت میں عشق کی بجلیاں کڑکیں
ایسے کہ جہان کفر لرز جائے
اور بوئے محبت سے کوئے جاناں مہک اٹھے۔

آمین آمین بجاہ سید المرسلین و شفیع المذنبین و قائد غر المحجلین جلین و صلی اللہ علیہ و علی الہ الطیبین الطاہرین و اصحابہ المتادبین

اَوَلَیۡسَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ ؕ بَلٰی ٭ وَهُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۸۱﴾

"اور کیا وہ جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمینوں کو اس پر قادر نہیں کہ ان جیسوں کو پیدا کر دے کیوں نہیں وہی عظیم الشان پیدا کرنے والا اور بہت جاننے والا ہے"۔

اس آیۂ کریمہ کا عمود ربی قدرتوں کی ہمہ گیریاں اور انسانی تمرد اور غرور کی اصلاح ہے۔ ایسا انسان جس کی سوچ مردہ ہونے کے بعد دوبارہ زندگی کی امکانی حدود سے ناآگاہ ہو۔ اسے سمجھا جا رہا ہے کہ وہ غور و فکر کرے زمین اور آسمان کی عظیم تخلیق میں۔ کیا یہ ٹھیک نہیں کہ زمین کے مہیب پھیلاؤ اور آسمان کی ہولناک اور دقیق نظام میں اللہ تعالیٰ کی ان گنت آیات کا نور جھلک رہا ہے۔ پہلے زمین کو دیکھیں، اس کے صحرا، اس کی وادیاں، اس کی پربت اور اس کی سنگلاخ چٹانیں، اس کے معمار کی عظمت کی نہایت محکم دلیلیں ہیں اور پھر یہ کہ زمین عالم بالا کے کسی چھوٹے سے سیارے کے مقابلہ میں ایک باریک نکتہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ آسمانوں کا محیر العقول کہکشانی نظام اپنی تمام

مفردات

اَوَلَیۡسَ: کیا وہ نہیں
ہمزہ انکار اور نفی اور واؤ عطف کے لیے ہیں
الَّذِیۡ: اسم موصولہ "وہ ذات"
خَلَقَ: اس نے پیدا کیا
السَّمٰوٰتِ: آسمانوں کو
وَالۡاَرۡضَ: اور زمین کو
بِقٰدِرٍ: قدرت والا
عَلٰۤی: اوپر
اَنۡ: یہ کہ
یَّخۡلُقَ: پیدا کرے
مِثۡلَهُمۡ: ان کی مثل
بَلٰی: ہاں
استفہام انکاری سے مستفادبہ کی تشریح کے لیے یہ کلمہ استعمال ہوا ہے
وَهُوَ: اور وہی
الۡخَلّٰقُ: پیدا کرنے والا
الۡعَلِیۡمُ: علم والا

مفردات

تر وسعتوں اور گہرائیوں کے ساتھ ایک قادر و قیوم ذات کے سامنے عقل کو سرفگندہ ہونے پر مجبور کر دیتا ہے اور عقل جس وقت آسمانوں اور زمینوں کے اس پیچیدہ اور ڈوبے ہوئے نظام کو سمجھنے سے عاجز پڑ جاتی ہے تو گویا وہ دھیرے دھیرے فطرت سلیم سے ہم آہنگ ہو کر لبادہ اسلام زیب تن کر لیتی ہے اور خدا کا قادر و قیوم ہونا خود بخود فہم و ادراک کے مرحلے طے کرنے لگ جاتا ہے۔ اس موقع پر قرآن مجید نہایت سادگی لیکن وقیع حکمت کے ساتھ یہ سوال پوچھ لیتا ہے کہ ان بڑے بڑے آسمانوں اور کھلی کھلی زمینوں کا پیدا کر لینا دشوار ہے یا اس چھوٹے سے انسان کا دوبارہ پیدا کر لینا جس کی حیثیت ان عظیم الجثہ چیزوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔

پیر کرم شاہ الازہری کس قدر خوبصورت انداز میں انسان کو اس کا مقام یاد کروا رہے ہیں(169)۔

''اس کی دیگر تخلیقات کے سامنے تمہاری حیثیت کیا ہے۔ ذرا پہاڑ کے ساتھ سر جوڑ کر کھڑے ہو تو تمہیں اپنی قامت کی درازی کا پتہ چل جائے، ذرا ہاتھی کے ساتھ اپنا وزن تو کرو اس کا ایک پاؤں بھی تم سے زیادہ سے وزنی ہے، ذرا ہرن کے ساتھ دوڑ تو لگاؤ دیکھیں کون آگے نکلتا ہے، ایک بھینس کے ساتھ کھانے کا مقابلہ کر کے دکھاؤ، یہ قیامت، یہ طاقت اور یہ حیثیت اور اس کے باوجود ایسی خرمستیاں کہ قدرت الٰہی پر حرف گیری کرنے کی جرأت کرنے لگے ہو'۔

''ان یخلق مثلھم ''میں ضمیر انسان کی طرف راجع ہے اور جملہ'' ھو الخلق ''معترضہ ہے اور واؤ اس میں اعتراضیہ ہے(170)۔ بعض مفسرین مثلھم میں ضمیر کا مرجع آسمان اور زمین بھی قرار دیتے ہیں(171)۔

واللہ اعلم بالصواب۔

اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡـئًا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ۝٨٢

''اس کا کام دیکھئے کہ جب کسی چیز کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے حکم دیتا ہے ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے''۔

کارگہہ حیات میں لمحوں کے انداز لاکھوں قضیئے چکا دیے جاتے ہیں۔ ہزاروں امور طے کیے جاتے ہیں اور ان گنت افعال کائنات کا دچیر رہے ہوتے ہیں۔ ہر آن نئی سے نئی چیزیں تخلیق کر دی جاتی ہے۔ چھوٹی بھی اور بڑی بھی، سادہ بھی اور پیچیدہ بھی لیکن صانع کائنات کو یہ سب کو کچھ کرنے کے لیے وقت کی طویل یا قصیر گھڑیوں کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی ایسے اسباب و اجزا اکٹھے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی فاصلوں کا قرب و بعد اس کی منشا کو متاثر کر سکتا ہے۔ وہاں صرف ارادہ کی توجہ ضروری ہے جونہی ارادہ ہوا ایجاد کا کرشمہ ایک جہان بن کر اپنے کائن کی عظمتوں کے گیت گانے میں مگن ہو جاتا ہے۔

اِنَّمَآ: کلمۂ حصر نہیں ہے سوائے اس کے

اَمۡرُهٗۤ: '' امر'' کا لفظ عربی لغت میں بہت سے معانی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ علامت، نشان، مشورہ، کسی چیز کا کثیر مقدار میں ہونا، حکم، معاملہ، حادثہ، بات اور کلام وغیرہ سب ہی اس لفظ کی معنوی تعبیرات ہیں جب یہ حکم کے معنوں میں استعمال ہو تو اس کی جمع اوامر آتی ہے اور جب دوسرے معنوں میں استعمال ہو تو اس کی جمع امور آتی ہے

اِذَاۤ: جب

اَرَادَ: ارادہ کرتا ہے

شَيۡـئًا: کسی چیز کا

اَنۡ يَّقُوۡلَ: تو کہتا ہے

لَهٗ: اس کے لیے

كُنۡ: ہو جا

فَيَكُوۡنُ: تو وہ امر کے مطابق ہو جاتی ہے

قرآن مجید نے قدرت خداوندی کے لیئے انسانی ذہنوں سے قریب تر جو تعبیر استعمال کی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ جب کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں بس اس کے لیئے اتنا ہی حکم کافی ہوتا ہے کہ اسے وہ کہ دے ہو جا بس وہ کام ہو جاتا ہے۔

آیۂ کریمہ میں امر کا لفظ اپنے لغوی معنوں میں استعمال نہیں ہوا ہے اور "کن فیکون" کا معنی بھی لغت کے میزان پر ہرگز یہ نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ کسی کام کے کرنے میں ''کـــن'' کہنے کا محتاج ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ تعبیرات کا یہ راز انسان کے پست ذہنوں میں ابلاغ کا نور ارزاں کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ انسانی ذہن میں اس سے زیادہ مختصر، چھوٹی اور سریع تعبیر اور کیا ہو سکتی ہے۔ بعض مفسرین یہاں ''کن فیکون'' کے الفاظ میں معنوی توجیہات بیان کرتے ہوئے بہت الجھے ہیں اور بعض دوسرے لوگوں نے دور از ضرورت قیاس آرائیاں بھی کی ہیں لیکن بات صرف اتنی ہے کہ مشرکین کہتے یہ تھے کہ مردوں کو دوبارہ کس طرح زندہ کر دیا جائے گا۔ اس جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''اس کے نزدیک کسی بڑی یا چھوٹی چیز کا پیدا کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا وہاں صرف ارادہ ہوتا ہے''۔

گویا ایک مرحلہ مرحلۂ ارادہ ہوتا ہے اور دوسرا مرحلہ، مرحلۂ ایجاد ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں ان دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔ اسے کسی لمبی چوڑی تدبیر کی ضروت نہیں ہوتی بس اس کے ارادے ہی سے اشیاء اور اعمال نتائج کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔

فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

''پاک ہے وہ ذات جس کے دست قدرت میں ہر چیز کی حکومت ہے اور تم سب اسی کی طرف پھیر دیئے جاؤ گے''۔

سورۂ یٰس آخری آیۂ کریمہ لفظ ''سبحن'' سے شروع ہو رہی ہے اور ''سبحن'' لفظ اپنی وضع میں دو اساسی معنوں کو سموئے ہوئے ہوتا ہے: ایک پاکیزگی اور دوسرا طاقت (172) گویا قرآن مجید عقل کے ان اندھوں کو سمجھا رہا ہے جو زندگی مابعد الموت محال تصور کرتے ہیں کہ ایسا ہونا ناممکن تو جب ہو کہ اللہ سبحانہ کمزور ہو جب سبھی طاقتیں اس کو سزاوار ہیں تو پھر یہ کہنا کہ یہ ہو سکتا ہے اور یہ نہیں ہو سکتا، اعتقاد کا زبردست فساد ہے اور اعتقاد کا یہ فساد چونکہ عیب بن کر اللہ عزوجل کی شان میں تنقیص کا موجب ہو سکتا ہے اس لئے ''سبحن'' لفظ میں پاکیزگی کا مفہوم فکر کی تہذیب کرتے ہوئے یہ عقیدہ بنا دیتا ہے کہ اللہ عزوجل تمام عیبوں سے پاک ہے۔

مفردات

فَسُبْحٰنَ: پس پاک ہے وہ
" سبحن" فعلان کے وزن پر ہے۔ اس کا معنی بڑی قوت والا اور" عیبوں سے بالکل پاک" سے کیا جاتا ہے

الَّذِیْ: وہ

بِیَدِهٖ: اس کے ہاتھ میں سے

مَلَكُوْتُ: عزت، اقتدار، حکومت، سلطنت اور ملک عظیم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ تاج العروس نے لکھا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی حکومت و اقتدار سے خاص ہے

كُلِّ شَیْءٍ: ہر چیز کی

وَّ اِلَیْهِ: اور اسی کی طرف

تُرْجَعُوْنَ: تم سب پھیرے جاؤ گے

''سبحن'' کے بعد ''بیدہ'' کے الفاظ ہیبت و جبروت کا ایک زبردست نقشہ قاری قرآن کے سامنے لے آتے ہیں اس طرح کہ بات صرف اتنی ہی نہیں کہ وہ منزہ عن العیوب اور طاقت والا ہے بلکہ ''سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہے''۔ کیا مجال کہ کوئی اس کی مرضی کے خلاف مو برابر بھی سرک سکے؟

خدائی طاقتوں کی جو تصویر سورہ یٰس کی اس آخری آیت میں پیش کی گئی اس کے رنگ و حسن کی کوئی دوسری مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ ''سبحن'' لفظ میں بذات خود جس طاقت کا اظہار تھا شک و شبہ اس سے لرزرہے تھے اس پر مستزاد ''بیدہ'' اور پھر اس پر اکتفانہ کیا گیا بلکہ ''ملکوت کل شی'' (حاکمیت ہر چیز کی) کی ترکیب لائی گئی۔ یاد رہے کہ قرآن مجید ''ملك'' اور ''ملکوت'' ہر دو کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اکثر مفسرین نے ان ہر دو کو ایک ہی معنی میں سمجھا ہے لیکن بعض مفسرین نے ملک سے مراد عالم اجسام اور ملکوت سے مراد عالم ارواح لیا ہے (173) مگر صحیح بات پہلی ہی ہے۔

تفسیری سیاق یہ ہوگا کہ:

> ''قرآن پڑھنے والوں ان لوگوں کی باتوں پر کان مت دھرو جو ہمارے رسول کو شاعر کہتے ہیں اور ان کے مرتبہ کا احساس ہی نہیں کرتے اور مرنے کے بعد زندگی کو امر محال تصور کرتے ہیں اور پھبتیاں کستے ہوئے کہتے ہیں کہ بوسیدہ ہڈیوں کو بھلا لباس حیات کون پہنائے گا۔ بس طاقتیں ساری تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں ہر چیز کی حاکمیت اور ملکیت و مالکیت بلا شرط اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ کمزور ہونے کے عیب اور کچھ نہ کر سکنے کی کمزوری سے پاک ہے''۔

وَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ

قرآن مجید کا یہ حصہ سورہ یٰس شریف کی جان ہے۔ عمود سورت جیسے روشن کرنیں بن کر برس رہا ہو اور رحمت کی بدلیاں بن کر چھا رہا ہو۔ تین چار باتیں تھیں جن کو پوری سورت میں مرکزی مضمون کی حثیت حاصل رہی، اللہ، رسول اللہ ﷺ، اسلام اور عقیدہ معاد۔

کتاب حکمت نے نہایت خوب صورتی سے ''والیہ ترجعو ن'' کہ کر اپنے پڑھنے والے کو جھنجوڑا کہ تم کہاں تک زندگی ضائع کرتے رہو گے۔ تم کب تک نشہ دنیا میں مبتلا رہو گے۔ وہ وقت آنے والا ہے کہ اسلام طوعاً یا کرہاً تم سے اپنی حقانیت منوالے گا اور رسول ﷺ کی عظمتیں تم پر کھل جائیں گی اور سچا خدا تمھیں اپنی طرف بلا لے گا اور پھر سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کرنے کے لئے تم سب کو وہ فیصلہ کے دن اپنے سامنے لا کھڑا کرے گا۔

پروردگار!

رب غفار!

کردگار!

خدائے ستار!

تیری توفیق سے سورہ یٰس کی تفسیر میں جو بے روح الفاظ رقم کئے

انہیں زندگی عطا فرما اس لیئے کہ تو ہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔۔۔!!

بحر حیرت میں سفینہ حیات کے ناخدا!

گناہوں کے بھنور میں الجھے ہوئے پریشان حال بندے کو ساحل راحت نصیب فرما!

روشنیوں کے خدا۔۔۔! اُجالوں کے خالق۔۔۔! بہاروں کے معطی۔۔۔! رحمتوں کے قاسم۔۔۔!

یٰس بحق یٰس

یٰس کی رحمتوں سے

یٰس کی روشنیوں سے

یٰس کے اجالوں سے

یٰس کی بہاروں سے

فہم یٰس کی طرف بڑھنے والے بندۂ عاجز کو

اس کے احباب کو

اور اس کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ کو پڑھنے والے

اہل محبت کو بہرہ مند فرما!

نور و رنکہت کا ماحول نصیب فرما!!

رنگ ونور کی جنتیں عطا فرما!!

سورہ یٰس کے ہر حرف کے صدقے

سورہ قلب کے ہر لفظ کے صدقے

سورہ رحمت کی ہر آیت کے صدقے

ہر بول ہر رنگ کے صدقے

ہر نظم ہر آہنگ کے صدقے

ہر معنی ہر مفہوم کے صدقے

سورہ یٰس کے مقسم بہ سے عشق دے دے، جذب دے دے، جنوں دے دے

حیات بھی اس کے لئے ہو ممات بھی اس کے لئے ہو

ظاہر بھی اسی سا ہو، باطن بھی اسی سا ہو

بس وہی ہو، وہی ہو، بس کچھ نہ ہو، وہی ہو

رسول اطہر ﷺ کے سینہ پر گنجینہ پر یٰس نازل کرنے والے رب جب زندگی کی سانسیں اکھڑیں

یٰس کا واسطہ۔۔۔!　　قرآن حکیم کا واسطہ۔۔۔!　　رسول رحیم کا واسطہ۔۔۔!

سہولت فرمانا، آسانی فرمانا اور مہربانی فرمانا

حمد وثنا کے ساتھ۔۔۔!　　مہر ووفا کے ساتھ۔۔۔!

اور حب بے ریا کے ساتھ

درود ہو تیرے نبی ﷺ اور ان کی آل پر

سلام ہو تیرے رسول اور ان کے اصحاب پر

آمین یا رب العالمین بحر متہ سید المر سلین صلی اللہ علیہ وا لہ واصحا بہ اجمعین

1۔زادالمسیر :ابن جوزی،تفسیر بقاعی

2۔تفسیر صوفی: سید محی الدین اچوی

3۔روح المعانی: آلوسی

4۔الجامع لا حکام القرآن :قرطبی ایضاً ضیاء القرآن :
پیر کرم شاہ ایضاً سراج المنیر :شربینی

5۔مشکوۃ المصابیح کتاب الایمان: ولی الدین عراقی

6۔لسان العرب: لابن منظور (مادہ ن ز ر)

7۔التفسیر الکبیر: امام فخر الدین رازی جز25 وتفسیر مظہری:
قاضی ثناء اللہ پانی پتی

8۔البحر المحیط :لعلامہ ابوحیان اندلسی

9۔جامع البیان فی تفسیر القرآن: لابن جریر طبری

10۔روح المعانی: آلوسی

11۔تفسیر الکبیر: رازی

12۔خزائن العرفان: نعیم الدین مرادآبادی،نور العرفان:
مفتی احمد یار خان بدایونی،جمل حاشیہ علی الجلالین

13۔تاج العروس: لعلامہ زبیدی حنفی (مادہ ق م ح)

14۔لسان العرب: لابن منظور (مادہ م م ح)

15۔انوار التنزیل: قاضی بیضاوی

16۔مفاتیح الغیب: امام فخر الدین رازی

17۔زادالمسیر فی علم التفسیر: ابن جوزی

18۔تفسیر التحریر والتنویر: ابن عاشور مطبوعہ تیونس

19۔جامع البیان فی تفسیر القرآن: ابن جریر طبری

20۔جامع البیان فی تفسیر القرآن: ابن جریر طبری

21۔التحریر والتنویر: ابن عاشور

22۔سورہ یس:70

23۔تفسیر الکبیر: رازی

24۔تفسیر المراغی: احمد مصطفےٰ المراغی

25۔تفسیر الکبیر: رازی

26۔مشکوۃ المصابیح: کتاب اعتصام بالسنۃ النبی ﷺ

27۔مواہب الرحمن: سید امیر علی شاہ

28۔تفسیر التحریر والتنویر: ابن عاشور

29:الجامع لا حکام القرآن: قرطبی

30۔لسان العرب: ابن منظور، تاج، محیط

31۔فتح القدیر: شوکانی

32۔فی ظلال القرآن: سید قطب ایضاً جواہر القرآن

ایضاً تفہیم القرآن ایضاً ضیاء القرآن ایضاً تدبر القرآن

33۔البحر المحیط ،زادالمسیر ،الجامع لاحکام القرآن، فتح القدیر،
مفاتیح الغیب تفسیر المراغی، تفسیر منہجی، حاشیہ جمل علی
الجلالین، صاوی علی الجلالین، روح المعانی، مواہب
الرحمن ،مظہری، التحریر، مدارک، روح البیان، کشاف،
سراج المنیر

34۔تفسیر مظہری: ثناء اللہ پانی پتی

35۔تدبر: امین احسن اصلاحی

36۔فی ظلال القرآن: سید قطب

37۔مواہب الرحمن: سید امیر علی

38۔زادالمسیر فی علم التفسیر ایضاً، روح المعانی، ایضاً
تفسیر مظہری

39۔زادالمسیر ،التحریر، مدارک التنزیل

40۔النساء:64

41۔الکہف:110

42۔تفسیر القرآن الحکیم: ابن کثیر

43۔مواہب الرحمن: سید امیر علی شاہ

44۔النساء:65,64,59

45۔مفاتیح الغیب: فخر الدین رازی

46۔النجم:3

47۔واللہ یختص برحمتہ من یشا (البقرہ:105)

48۔سراج المنیر :خطیب شربینی ایضاً انوار التنزیل بیضاوی
ایضاً مفاتیح الغیب: رازی ایضاً تفسیر القرآن الحکیم:
ابن کثیر ایضاً تفسیر طبری: لابن جریر

49۔روح المعانی: آلوسی

50۔لسان العرب: ابن منظور

51۔مفاتیح الغیب: فخر الدین رازی

52۔تفسیر قاسمی: جمال الدین قاسمی، ایضاً تفسیر مظہری:
ثناء اللہ پانی پتی

53۔مواہب الرحمن: سید امیر علی

54۔الجامع لاحکام القرآن: قرطبی

55۔الجامع لاحکام القرآن: قرطبی

56۔الکشاف: زمخشری

57۔ مفاتیح الغیب: رازی ایضاً تفسیر القرآن العظیم :
ابن کثیر ایضاً تفسیر نمونہ

58۔الجواہر فی تفسیر القرآن: طنطاوی جوہری

59۔ ان اللہ علی کل شئی قدیر

60۔والذین امنوا اشد حب للہ

61۔الجامع لاحکام القرآن: قرطبی

62۔مفاتیح الغیب، روح المعانی ایضاً زادالمسیر :ابن جوزی

63۔مفاتیح الغیب: رازی ایضاً میزان: طباطبائی

64۔روح البیان: شیخ اسماعیل حقی

65۔مفاتیح الغیب: رازی

66۔تفہیم القرآن: مودودی

67۔تفسیر مظہری: قاضی ثناء اللہ پانی پتی

68۔التحریر: ابن عاشور

69۔انبیاء:26۔27، معارج:35، حجرات:13

70۔مفاتیح الغیب: رازی

71۔الجامع لاحکام القرآن: قرطبی

72۔مفاتیح الغیب: رازی

73۔الجامع لاحکام القرآن: قرطبی

74۔الترغیب والترہیب باب الصلوٰۃ علی النبی: منذری

75۔اضواء البیان: شنقیطی مدنی

76۔التحریر والتنویر: ابن عاشور

77۔مفاتیح الغیب: رازی

78۔فتح القدیر: شوکانی

79۔فتح القدیر: شوکانی

80۔تفسیر کبیر: رازی ایضاً تفسیر مراغی: احمد مصطفےٰ المراغی

81۔فتح القدیر: شوکانی ایضاً الجامع لاحکام القرآن: قرطبی

82۔مدارک التنزیل: ابوالبرکات نسفی

83۔سرج منیر: خطیب شربینی

84۔(I)Economic botony by pandey

(II) Economic botony by g.h hill

علم النبات: موبلی (III) تفسیر نمونہ(IV)

85۔concepts of islam by mohammad ahmed

86۔تاج العروس: زبیدی حنفی ایضاً لسان العرب ابن
منظور ایضاً اقرب الموارد: شرتونی

87۔فتح القدیر: شوکانی

88۔حدائق بخشش: احمد رضا خان بریلوی

89۔تنویر المقیاس :ابن عباس ایضاً فتح القدیر :شاکانی
ایضاً کشاف:زمخشری
90۔روح المعانی: سید محمود آلوسی
91۔تفسیر القرآن الحکیم:ابن کثیر ایضاً تفسیر طبری:ابن جریر
92۔تفسیر القرآن الحکیم:ابن کثیر
93۔روح المعانی: سید محمود آلوسی
94۔حکیم الامت اقبال
95۔حکیم الامت اقبال
96۔امجد علی امجد:کلیات صفحہ 226 مطبوعہ ماورا پبلشرز
97۔التحریر والتنزیل:ابن عاشور
98۔انوار التنزیل: قاضی بیضاوی
99۔زاد المسیر :ابن جوزی
100۔کیفی: کیفیات مطبوعہ ادارہ اسلامیات لاہور
101۔تفسیر کبیر: رازی
102۔لسان العرب:ابن منظور
103۔المیزان:طباطبائی
104۔الجامع لاحکام القرآن:قرطبی
105:روح المعانی: آلوسی ایضاً تنویر المقیاس:ابن عباس
106۔ زاد المسیر فی علم التفسیر:ابن جوزی ایضاً کشاف:
زمخشری ایضاً سراج المنیر :شربینی ایضاً فتح القدیر:
شوکانی
107۔روح المعانی: آلوسی
108۔کنزالایمان:اعلیٰ حضرت بریلوی
109۔اعراب القرآن: نحاس ایضاً انوار التنزیل
110۔کنزالایمان:اعلیٰ حضرت بریلوی
111۔البیان:احمد سعید کاظمی
112۔زاد المسیر فی علم التفسیر:ابن جوزی
113۔التفسیر الواضح :محمود حجازی ایضاً زاد المسیر :
ابن جوزی ایضاً تفسیر القرآن :ابن کثیر ایضاً انوار
التنزیل: بیضاوی
114۔تفسیر الکبیر: رازی ایضاً روح المعانی: آلوسی
115۔تفسیر مظہری: قاضی ثناء اللہ پانی پتی
116۔فی ظلال القرآن: سید قطب شہید
117۔تفسیر مظہری: قاضی ثناء اللہ پانی پتی
118۔الجامع لاحکام القران: قرطبی
119۔تفسیر القران: مہمی ایضاً فوائد عثمانی: شبیر احمد عثمانی
ایضاً خزائن العرفان :نعیم الدین مراد آبادی ایضاً
تفسیر کبیر فخر الدین رازی
120۔تفسیر طبری :ابن جریر ایضاً روح المعانی: سید محمود
آلوسی ایضاً الجامع لاحکام القرآن: قرطبی
121۔انوار التنزیل: بیضاوی، تفسیر مراغی: احمد مصطفیٰ
مراغی، جمل: سلیمان جمل، جلالین: جلال الدین سیوطی،
جلال الدین محلی
122۔المفردات فی غریب القرآن: راغب اصفہانی
123۔تفسیر القرآن العظیم: حافظ ابن کثیر
124۔روح البیان: علامہ اسماعیل حقی
125۔تفسیر مظہری: قاضی ثناء اللہ پانی پتی
126۔ضیاء القرآن: پیر محمد کرم شاہ الازہری
127۔روح البیان: علامہ اسماعیل حقی
128۔روح البیان: علامہ اسماعیل حقی
129۔سنن ابن ماجہ کتاب الزہد:ابن ماجہ
130۔تفسیر القرآن الحکیم :ابن کثیر ایضاً روح البیان :
علامہ اسماعیل حقی ایضاً تفسیر نمونہ: قلمکاروں کی ایک
جماعت ایضاً ضیاء القرآن: پیر محمد کرم شاہ الازہری
ایضاً تفسیر مظہری: ثناء اللہ پانی پتی ایضاً تفسیر صاوی:
علامہ صاوی
131۔تفسیر الحسنات: علامہ ابوالحسنات
132۔سورہ ص:28
133۔تفسیر کبیر رازی
134۔تفسیر ابن کثیر: امام رازی
135۔تفسیر مظہری: ثناء اللہ پانی پتی ایضاً تفسیر طبری ابن
جریر ایضاً تفسیر القرآن العظیم: ابن کثیر وغیرہم
136۔تدبر قرآن: امین اصلاحی
137۔اضواالبیان: شنقیطی مدنی
138۔تفسیر کبیر: امام رازی ایضاً تفہیم القرآن: مودودی
139۔تفسیر نمونہ: قلم کاروں کی ایک جماعت
140۔روح البیان: اسماعیل حقی
141۔روح البیان: اسماعیل حقی ایضاً التحریر: ابن عاشور
ایضاً مسلم شریف: امام مسلم قشیری
142۔مواہب الرحمٰن: سید امیر علی شاہ
143۔زاد المسیر فی علم التفسیر: ابن جوزی
144۔الجواہر: طنطاوی
145۔روح المعانی: آلوسی
146۔روح المعانی: آلوسی
147۔تفہیم القرآن: مودودی
148۔الصاوی علی الجلالین: علامہ صاوی
149۔الجامع لاحکام القرآن: قرطبی ایضاً مدارک التنزیل: نسفی
150۔روح البیان: اسماعیل حقی ایضاً روح المعانی: آلوسی
151۔تاج العروس: زبیدی حنفی ایضاً الصحاح: جوہری
152۔فی ظلال القرآن: سید قطب ایضاً الجواہر: علی طنطاوی
153۔کشف الاسرار وعدۃ الابرار: عبداللہ انصاری
154۔التحریر والتنویر: ابن عاشور
155۔تفسیر صوفی: سید محی الدین اچوی
156۔زاد المسیر :ابن جوزی
157۔تفسیر ابن جریر: طبری
158۔زاد المسیر :ابن جوزی
159۔روح المعانی: آلوسی
160۔التحریر: ابن عاشور
161۔انوار التنزیل: بیضاوی
162۔تدبر قرآن: امین اصلاحی
163۔تفسیر نمونہ: قلم کاروں کی ایک جماعت
164۔الواقعہ:72-71
165۔تفسیر النہر الماد: ابوحیان اندلسی ایضاً الجامع لاحکام
القرآن: قرطبی ایضاً کشاف: زمخشری
166۔تفسیر قرآن مجید: سید علاؤالدین ضامن
167۔الجواہر: طنطاوی
168۔الجوہر: طنطاوی ایضاً تفسیر نمونہ: قلم کاروں کی
ایک جماعت
169۔ضیاء القرآن: پیر کرم شاہ الازہری
170۔تفسیر التحریر: ابن عاشور
171۔البحر المحیط: تاج الدین حنفی النحوی
172۔ تاج العروس: زبیدی حنفی، لسان العرب :
ابن منظور، المفردات: راغب اصفہانی
173۔تفسیر القرآن الحکیم: ابن کثیر